جمالیاتی تنقید نظریہ و اطلاق: منتخب اردو ادبی رسائل میں فنون لطیفہ کی پیشکش

مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار:

غلام آمنہ

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۲ء

جمالیاتی تنقید نظریہ و اطلاق: منتخب اردو ادبی رسائل میں فنونِ لطیفہ کی پیشکش

مقالہ نگار:

غلام آمنہ

یہ مقالہ

ایم۔ فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو یجز

(اُردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگو یجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۲ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: جمالیاتی تنقید نظریہ و اطلاق: منتخب اردو ادبی رسائل میں فنون لطیفہ کی پیشکش

پیش کار: غلام آمنہ　　　رجسٹریشن نمبر:۔ 1896 /M/U/F19

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: زبان و ادب اردو

ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان　　　＿＿＿＿＿＿＿＿＿

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی　　　＿＿＿＿＿＿＿＿＿

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

اقرار نامہ

میں ، غلام آمنہ حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

غلام آمنہ

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۲ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ اور دفاع مقالہ کی منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرستِ ابواب	v
Abstract	viii
اظہارِ تشکّر	x
باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث	
الف۔ تمہید	
I۔ موضوع کا تعارف	۱
ii۔ بیان مسئلہ	۲
Iii۔ مقاصد تحقیق	۳
Iv۔ تحقیقی سوالات	۳
v۔ نظری دائرہ کار	۳
vi۔ تحقیقی طریقہ کار	۵
vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۵
viii۔ تحدید	۶
ix۔ پس منظری مطالعہ	۷
x۔ تحقیق کی اہمیت	۷
ب۔ بنیادی مباحث	
الف۔	۸
ا۔ جمالیات تعارف و جہتیں	۱۱

۲۔ مشرقی جمالیاتی افکار کا جائزہ ۱۹
۳۔ جمالیاتی اردو ادب کی روایت ۲۸
ب۔ جمالیاتی تنقید اور فنون لطیفہ کی روایت ۳۰
ا۔ جمالیاتی تنقید اور فنون لطیفہ ۳۳
ج۔ مضمون نگاری، تعارف و اقسام ۳۹
ا۔ اردو مضمون نگاری کی روایت ۴۰
حوالہ جات ۴۵
باب دوم: "سیپ" کا فنونِ لطیفہ کے فروغ میں کردار ۴۷
الف۔ مصوری ۵۲
ا۔ مصوری کی روایت کے مضامین ۵۴
۲۔ شخصیت مصور پر مضامین ۵۹
ب۔ موسیقی ۶۶
ا۔ فنِ موسیقی کے مضامین ۶۷
۲۔ موسیقی کی روایت کے مضامین ۷۱
۳۔ شخصیتِ موسیقار پر مضامین ۷۴
ج۔ خطاطی ۷۸
ا۔ خطاطی کی روایت کے مضامین ۷۸
۲۔ شخصیت خطاط کے مضامین ۸۲
د۔ سنگ تراشی ۸۷
ا۔ سنگ تراشی کی روایت کے مضامین ۸۸
۲۔ شخصیتِ سنگ تراش پر مضامین ۹۰
حوالہ جات ۹۳

باب سوم: "ادبیات" کا فنون لطیفہ کے فروغ میں کردار ۹۶
الف۔ مصوری ۹۷
ا۔ مصوری کی روایت کے مضامین ۹۸
۲۔ شخصیت مصور پر مضامین ۱۰۲
ب۔ موسیقی ۱۰۹
ا۔ موسیقی کی روایت کے مضامین ۱۱۰
۲۔ شخصیتِ موسیقار پر مضامین ۱۱۶
ج۔ خطاطی ۱۲۶
ا۔ خطاطی کی روایت کے مضامین ۱۲۶
۲۔ شخصیت خطاط کے مضامین ۱۲۹
د۔ سنگ تراشی ۱۳۳
ا۔ سنگ تراشی کی روایت کے مضامین ۱۳۴
۲۔ شخصیتِ سنگ تراش پر مضامین ۱۳۵
حوالہ جات ۱۳۸
باب چہارم: مجموعی جائزہ، تحقیقی نتائج اور سفارشات ۱۴۱
الف۔ مجموعی جائزہ ۱۴۱
ب۔ تحقیقی نتائج ۱۴۷
ج۔ سفارشات ۱۴۸
کتابیات ۱۴۹

ABSTRACT

Title: Aesthetic criticism theory and application: Presentation of fine arts in selected Urdu Literary Magazines

The M.Phil Urdu research thesis is the study of presentation of fine arts in Urdu literary magazines. Two of the notable magazines of current era (*Seep & Adbiyaat)* are chosen to discuss and evaluate the presentation of fine arts among them. Various articles in these Urdu literary magazines covers different aspects of fine arts. Purpose of the research is to understand the relationship of literature and fine arts, to practically exert the aesthetic theory and to analyze the aesthetic features of Urdu articles published in specified magazines- Magazines & newspapers are influential for survival of language & literature. Urdu literary magazines & journals give new thematic essence and artistic dimensions to Urdu language & literature. One of the distinguished perspectives is the divulgement of fine arts in literary magazines through articles. Fine arts are the way of intimating aesthetic sense. In literature, fine arts consist of poetry, music, painting and sculpture. Society, man and fine arts are interconnected. Artists are the most sensitive people of society. They keenly observe the prospects of society, emotions of people & pains of everyone and unveil their empathy in piece of art. Alteration of ideas, perspectives and emotions gravitates fine arts to find wide new tracks to present public trends. This research paper comprehends various articles presenting fine arts composed in quarterly magazines "*Seep*" & "*Adbiyaat*". Both magazines have allocated a separate section for the write-ups regarding fine arts. The articles published in these magazines fully reflect the necessity and importance of fine arts in contemporary era. This research thesis encompasses the analytical study of the articles, demonstration of aesthetic facets of the write-ups and analysis of contribution of these magazines in prompting fine arts. Qualitative & analytical research methodology is followed to acquire authenticity of collected data. The research paper is advantageous for artists, researchers and critics. The research paper comprises four chapters. First of which consists of Topic Introduction and basic debates regarding literature, fine arts, aesthetic criticism, article writing and literary journals. Second chapter "The role of '*Seep*' in prompting of fine arts" consists of analytical study of selected write-ups composed on the topic of fine arts. The analysis is divided in various categories, such as history of art, artist and the art itself, according to the subject of articles. Third chapter "The role of '*Adbiyaat*' in prompting of fine arts" covers the analysis of chosen essays written on various kinds of fine arts. The analytical study embeds different categories of fine arts according to subject-matter of the magazine's write-ups. All the discussion of the research is briefly summarized in fourth chapter named "Conclusion, Research results & Recommendations". Research results are derived and composed in this chapter. Besides, recommendations regarding research on fine arts & literary journals are given at the end of the last chapter.

اظہارِ تشکّر

بے پناہ حمد و ثناء اس ذات کی جو رب العالمین ہے۔ جس کی بے حساب نوازشات، رحمتیں اور برکات میرے لیے ہر لمحہ شامل حال ہیں۔ شکر اللہ تبارک و تعالیٰ کا جس کے فضل و کرم اور عنایت خاص سے یہ مقالہ پایہ تکمیل تک پہنچا۔

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز شعبہ اردو کی شکر گزار ہوں جنہوں نے تحقیقی مراحل میں میری مدد اور راہنمائی کی۔ خصوصا نگران مقالہ ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان صاحبہ کی شکر گزار ہوں جن کی بر وقت رہنمائی اور معاونت کے نتیجے میں تحقیق کے مراحل میرے لیے آسان ہوئے۔ جنہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود قدم بہ قدم اس مقالے کی تکمیل اور ترتیب و تدوین کے سلسلے میں میری علمی و فکری رہنمائی فرمائی۔ ان کی قیمتی ہدایات و معاونت میرے لیے بہت بڑا اعزاز اور سرمایہ افتخار ہے۔

ان عظیم ہستیوں کی شکر گزار ہوں جن کا شکریہ ادا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا: أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ (میرا بھی شکر کرتا رہ اور اپنے ماں باپ کا بھی) میری مراد میرے والدین اور بھائی، بہن ہیں جن کی دعاؤں اور حوصلہ مند ساتھ نے زندگی کے ہر موڑ پر میری مشکلات آسان کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا مشفقانہ سایہ تا دم حیات قائم رکھے۔ آمین

پاکستان میں موجود مختلف لائبریریز کے سٹاف ممبران کی شکر گزار ہوں جنہوں نے تحقیقی مراحل میں میری راہنمائی فرمائی جن میں نمل یونیورسٹی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ڈاکٹر حمید اللہ لائبریری، شریعہ اکیڈمی لائبریری، کنٹونمنٹ چلڈرن لائبریری، سنٹرل لائبریری واہ کینٹ اور مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد شامل ہیں۔ آخر میں مجموعی طور پر میں ان تمام افراد کی مشکور و ممنون ہوں جنہوں نے کسی بھی طرح اس مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں میری رہنمائی فرمائی۔

اللہ تعالیٰ ان سب کو دنیا و آخرت میں بہترین اور عظیم اجر عطا فرمائے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ مجھے، تمام قارئین اور اہل اسلام کو قرآن و سنت کی تعلیمات سے اپنی زندگیاں منور کرنا نصیب فرمائے۔ آمین

غلام آمنہ

اسکالر ایم فل اُردو

باب اول

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید

i. موضوع کا تعارف:

اردو زبان کے فروغ اور اس کی ترویج و اشاعت میں ادبی رسائل و جرائد کا کلیدی کردار رہا ہے۔ اردو صحافت کی نوعیت کچھ بھی ہو علمی، مذہبی، سیاسی، تہذیبی یا ثقافتی لیکن ادبی صحافت کی عظمت و اہمیت اپنی جگہ ہے. زبان وادب کی بقا کے لیے اخبارات اور رسائل کا ہونا ناگزیر ہے اس وسیلہ سے اردو کی ہمہ جہت ترقی ہوتی ہے. اردو کے ادبی رسائل زبان وادب کو نئی فکر، نیا جہان اور نیا مواد عطا کرتے ہیں اردو کے ادبی رسائل ہمیشہ سے زبان و ادب میں نئی جہتیں پیش کرتے رہے ہیں۔ رسائل و جرائد میں مختلف عنوانات پر مختلف ادیبوں کے خیالات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اسی طرح رسائل وجرائد کے خصوصی شماروں کی بھی زبردست اہمیت ہے۔ ہر دور میں قارئین کے ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ تحقیق و تنقید کے طالب علموں کے لیے ادبی رسائل وجرائد نے رہنمائی کی ہے۔ادبی جرائد کی تاریخ دیکھیں تو آزادی سے قبل "اردوئے معلیٰ (حسرت موہانی)"، "ادب لطیف (صدیقہ بیگم)"، "انگارے (سجاد ظہیر)"، "مخزن (شیخ عبد القادر)"، "نیادور (وضاحت حسین رضوی)"، "نقوش (احمد ندیم قاسمی)" اور "قومی زبان (ممتاز احمد خان)" جیسے کئی رسائل شائع ہوئے۔

فنون لطیفہ جمالیاتی حس کے اظہار کا زریعہ ہیں۔ ان کی پانچ اقسام ہیں: موسیقی، مصوری، خطاطی، سنگ تراشی اور رقص۔ مگر ادب میں فنون لطیفہ سے مراد صرف شاعری، موسیقی، مصوری اور سنگ تراشی لیا جاتا ہے۔ فرد اور معاشرہ فنونِ لطیفہ سے مربوط رشتہ رکھتے ہیں بلکہ فنونِ لطیفہ اور زندگی و معاشرتی نظام لازم وملزوم ہیں۔ فنونِ لطیفہ بشمول شعر و ادب گاہے گاہے ان سے متحرک ہوتے ہیں، گاہے فرد و معاشرہ کی رہنمائی کرتے ہیں۔ دورِ جمہور جن میلانات و رجحانات کے ساتھ رواں دواں ہے اس تناظر میں کہا جاسکتا ہے کہ فنونِ لطیفہ اور دیگر تمام

تخلیقات و معروضات عوامی خیالات و جذبات اور محسوسات کی ترجمانی سے نئی انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ آج فنونِ لطیفہ کے حصار، خواص سے پھیلتے ہوئے عوام تک پہنچ گئے ہیں لہٰذا تخلیقات کے موضوعات اور تکنیک متنوع ہونے کے ساتھ انقلابی تبدیلیوں سے ہمکنار ہو رہے ہیں۔ فنکار و قلم کار معاشرے کے حساس ترین افراد ہوتے ہیں، اس لیے تمام انسانوں سے ان کی وابستگی لازمی ہے۔ لوگوں کے چہرے اور معاشرتی نظام پر اُبھرنے والی لکیریں پڑھنا انھیں آتا ہے اس لیے ہر کس و ناکس کے جذبات و کیفیات کو وہ محسوس کر لیتے ہیں اور اپنی تخلیقات کا محور بناتے ہیں۔

زیر نظر تحقیق میں سہ ماہی "سیپ" اور سہ ماہی "ادبیات" میں چھپنے والے فنون لطیفہ کے حوالے سے مضامین کو موضوع بنایا گیا ہے. ادبیات ایک اہم تحقیقی و ادبی جریدہ ہے۔ جس کا اجراء ۱۹۸۷ میں اکادمی ادبیات پاکستان نے کیا جبکہ سیپ کراچی سے شائع ہونے والا اہم ادبی جریدہ ہے۔ جس کے بانی اور مدیر نسیم درانی ہیں۔ اس کا اجراء ۱۹۶۴ میں کراچی سے ہوا۔ ان دونوں جرائد میں فنون لطیفہ کے مضامین کے لیے الگ جگہ مختص ہے۔ ان جرائد میں شائع ہونے والے مضامین عصرِ عہد میں فنون لطیفہ کی ضرورت و اہمیت کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ جمالیاتی حسن کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ فن و ادب کی تنقید بنیادی طور پر جمالیاتی ہوتی ہے۔ زیر نظر تحقیق میں دونوں مجلات میں فنونِ لطیفہ کے حوالے سے موجود مضامین کا تحقیقی جائزہ لیا جائے گا۔ اور ان مضامین میں موجود جمالیاتی پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی جائے گی اور دیکھا جائے گا کہ ادبی رسائل فنونِ لطیفہ کے فروغ میں کس طرح معاون ثابت ہو رہے ہیں۔

۲: بیان مسئلہ:

فنون لطیفہ کا ادب سے گہرا تعلق ہے۔ فنون لطیفہ، ادب اور جمالیات کے تعلق کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ نظریہ جمالیات کا فنون لطیفہ پر اطلاق کر کے دیکھا جائے اس کے لیے ہم تمام فنون لطیفہ کی اقسام کو نہیں لے سکتے لہٰذا اہم ادبی رسائل میں فنون لطیفہ کے مضامین کو جمالیاتی نظریات کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کریں گے۔ اور یہ جانچنے کی کوشش کریں گے کہ ان مضامین میں جمالیات کے کن پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اور ہمارے ہاں اردو ادب کے پس منظر میں فنون لطیفہ کو کیسے پیش کیا جا رہا ہے۔

۳۔مقاصدِ تحقیق:

مجوزہ تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں:

۱۔ ادب اور فنون لطیفہ کے تعلق کو سمجھنا۔

۲۔ جمالیاتی نظریے کا عملی اطلاق کرنا۔

۳۔ اردو مضامین کے جمالیاتی پہلو کا احاطہ کرنا۔

۴۔تحقیقی سوالات:

اس تحقیقی مقالے میں درج ذیل سوالات کو مد نظر رکھا جائے گا۔

۱۔ ادب اور فنون لطیفہ کیسے ہم آہنگ ہوتے ہیں؟

۲۔جمالیاتی اثر آفرینی کی ادب میں کیا اہمیت ہے؟

۳۔اردو مضامین پر فنون لطیفہ کے کون سے جمالیاتی اثرات ہیں؟

۵۔ نظری دائرہ کار:

ایک تخلیق کار کا حسن و قبیح اور معائب و محاسن کا مصوری، سنگ تراشی، مجسمہ سازی، موسیقی، شاعری اور رقص کی شکل میں اظہار ”ایستھیٹکس“ یا جمالیاتی ذوق کہلاتا ہے۔ لفظ و ہیت کو مقدم رکھتے ہوئے کسی فن پارے کے موضوع و معروض کا ناقدانہ جائزہ جمالیاتی تنقید کا پہلو ہے۔

اٹھارھویں صدی میں ”ایستھیٹکس“ یا جمالیاتی حس پر باقاعدہ اور منظم طور پر کام کیا گیا اور اسے فلسفہ ہی کی ایک شاخ تصور کیا جانے لگا۔ اس فلسفے کے تحت آرٹ اور اس کے تجربات کا مطالعہ کیا جانے لگا۔ یہ فلسفہ اٹھارویں صدیں کے یورپ میں ابھرا اور پھر اس نے انگلستان میں ترقی پاتے ہوئے شاعری، مجسمہ سازی، موسیقی اور رقص جیسی اصناف پر اپنے اثرات مرتب کرنا شروع کر دیئے۔ اسی صدی میں پہلی دفعہ ہی ان تمام پہلوؤں کو

فن یا آرٹ کے تحت یکجا کر دیا گیا۔ بام گارٹن نے سب سے پہلے فلسفۂ حسن کے لیے "ایستھیٹکس" کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ یہ کہا تھا کہ یہ فلسفے کا ایک علاحدہ مستقل موضوع ہے۔ ایمینوئل کانٹ نے جمالیات کو فلسفہ کا باقاعدہ موضوع بنایا اور اس پر منظم انداز سے بحث کی۔ کانٹ کا خیال تھا کہ خوبصورتی چیز کے افعال سے آزاد ایک خاصیت کا نام ہے۔

میاں محمد شریف جمالیاتی عناصر کے ضمن میں اپنا تصور پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جمالیات فلسفے کی وہ شاخ ہے جس میں حسن و جمال کی فنی تخلیق پر گفتگو کی جاتی ہے. شاعری میں جب لفظ و معنی لاشعور سے شعور میں جلوہ افروز ہوتے ہیں تو ان کا حسن نکھر آتا ہے. اگر وہ پہلے دھندلے اور مبہم ہوں تو پھر وہ روشن اور واضح ہو جاتے ہیں. ان میں کہیں خود کلامی آتی ہے اور کہیں تمثیلی انداز میں دوسرے سے مخاطب ہوتے ہیں غرض دونوں طرح سے تخلیقِ معنی کا طلسم ہمیں مسحور کرتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ ادب کے جمالیاتی پہلو کی وضاحت میں اپنا تصور یوں پیش کرتے ہیں:

"محض الفاظ اپنی نشست اور ترنم کے اعتبار سے ہم میں حسن کا شعور نہیں پیدا کر سکتے، ان کا بامعنی ہونا بھی ضروری ہے۔"

جمالیاتی نقاد ادبی تخلیقات میں حسن اور دلکشی پیدا کرنے والے خصائص کے تجزیہ اور مطالعہ کو اولین اور اساسی اہمیت دیتا ہے. اردو ادب کے محقق زاہد ہمایوں کے مطابق جمالیاتی تحریک کی کم سے کم تین اشکال ممکن ہیں :اول براہ راست کسی شے کو دیکھنے سے حظ حاصل ہونا سے احساس اول کہتے ہیں۔ دوسری یہ کہ کسی شے کو دیکھ کر کسی اور شے کا وجدان ہو جانا اور تیسری یہ کہ حواس اور وجدان کی ملی جلی تحریک سے ایک سلسلہ ادراک قائم ہو جائے جو مسرت بخش ہو۔

فلسفہ جمالیات کے اس تنقیدی پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے منتخب ادبی جرائد میں فنونِ لطیفہ کے مضامین کا جائزہ لیا جائے گا. تحقیق ہذا ادبی میدان میں محققین اور ناقدین کے لیے جمالیاتی تنقید اور فنونِ لطیفہ کے حوالے سے نئے زاویے سامنے لائے گی۔

۶۔ تحقیقی طریق کار:

زیر تحقیق موضوع "جمالیاتی تنقید نظریہ و اطلاق: منتخب اردو ادبی رسائل میں فنون لطیفہ کی پیشکش" کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ ہے. جس کے لیے دو ادبی رسائل کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں سر فہرست "ادبیات" کے انتخاب کی وجہ پاکستانی ادبی رسائل میں اس کی مقبولیت اور اردو زبان کے فروغ کے لیے قائم کیے جانے والا حکومتی ادارہ اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے اس کا اجراء ہے جبکہ سیپ بھی عصر رواں کا اہم ادبی رسالہ ہے جو کہ اردو ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہا ہے دونوں رسائل کے انتخاب کی وجوہات میں ایک وجہ ان کا ہم عصر ہونا اور ان میں فنون لطیفہ کے مضامین کے علیحدہ گوشہ کا وجود بھی ہے. جو کہ عموماً دوسرے رسائل میں کم دیکھنے کو ملتا ہے۔

زیر نظر موضوع بنیادی طور پر تحقیقی تنقیدی نوعیت کا ہے جس کا بنیادی ڈھانچہ تحقیق کی اہم قسم دستاویزی یا تاریخی تحقیق پر استوار کیا جائے گا. دستاویزی تحقیق، تحقیق کی ایسی قسم ہے جو مصنف اس کے عہد اور دستاویز کے بارے میں تمام ضروری مباحث کا احاطہ کرتی ہے۔اس طرح کے تحقیقی طریقہ کار میں عصری مسائل کا حل ماضی میں تلاش کیا جاتا ہے اس طریقے کے انتخاب کی بنیادی وجہ یہ ہے کے اس تحقیقی طریقہ کار میں ہم اس قابل ہوتے ہیں کے عصر حاضر میں ماضی کے بارے میں جو نظریات اور اعمال پائے جاتے ہیں ان کے بارے میں موجود معلومات کی دوبارہ جانچ پرکھ کر سکیں۔

فنون لطیفہ کے فروغ میں رسائل و جرائد انتہائی اہمیت کے حامل ہیں-لہذا اس تحقیق کے بنیادی مآخذ کے طور پر دونوں رسائل کے تمام نمبرز کو لیا جائے گا جن میں فنون لطیفہ کے حوالے سے مضامین موجود ہوں گے۔ جبکہ متعلقہ ثانوی مآخذ (اردو کی تحقیقی کتب، تحقیقی مقالات، ریسرچ پیپرز، انگریزی لغات، اردو لغات اور ویب گاہوں) سے استفادہ کیا جائے گا-اور آخر میں نتائج اور سفارشات بھی پیش کی جائیں گی۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

اردو ادب میں جامعاتی سطح پر "جمالیاتی تنقید نظریہ و اطلاق: منتخب اردو ادبی رسائل میں فنون لطیفہ کی پیش کش" (بحوالہ خصوصی "سیپ" اور "ادبیات") کے حوالے سے کوئی سندی کام نہیں ہوا. لہذا ان رسائل کے

حوالے سے میرا کام اردو ادب میں وسعت کا باعث بنے گا اس لئے اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ ایک نیا موضوع ہے۔ "سیپ" اور "ادبیات" کی ادبی خدمات کے حوالے سے تحقیقی کام ہوا ہے۔ ان مقالہ جات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ سید فاضل حسین، معاصر اردو افسانے کے فکری رجحانات کا تجزیاتی مطالعہ (سہ ماہی "ادبیات" ۲۰۰۱ تا حال میں شائع شدہ افسانوں کے حوالے سے)، مقالہ برائے ایم فل اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد ،2019 (غیر مطبوعہ)

۲۔ سعدیہ افتخار، اکادمی ادبیات پاکستان کی خدمات: تحقیقی و تنقیدی جائزہ (اردو زبان کے حوالے سے)، مقالہ برائے ایم فل اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، 2015 (غیر مطبوعہ)

۳۔ تیمور اختر، ادبیات کے شخصیات نمبرز کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے ایم فل اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون سائنس و ٹیکنالوجی، اسلام آباد، ۲۰۱۷ (غیر مطبوعہ)

۴۔ آصف جہانگیر، سیپ کے تخلیقی اور فکری کردار کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۲ (غیر مطبوعہ)

۸۔ تحدید:

زیر تحقیق موضوع میں ادبی رسالہ "سہ ماہی سیپ" اور ادبی مجلہ "سہ ماہی ادبیات" کے وہ مضامین جن کا تعلق فنونِ لطیفہ سے ہے وہ شاملِ تحقیق ہوں گے اس کے علاوہ دیگر مضامین میری تحقیق کا حصہ نہیں ہوں گے۔ شاعری چونکہ الگ صنف ادب بھی ہے اور اس پر کافی تحقیقی کام ہو چکا ہے لہذا اسے شامل تحقیق نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ زیرِ تحقیق تخلیقی مواد زیادہ ہے اس لیے تخلیقات کا متن بطورِ حوالہ حرف نمونہ کی حد تک پیش ہو گا نیز اگر کسی تخلیق کا کوئی حصہ کسی شمارے میں ادھورا پیش کیا گیا ہو اور باقی پیش کش کسی اور کتاب میں ہو تو ہمارا حدودِ اربعہ صرف ان شماروں میں پیش کردہ تخلیقات سے ہو گا۔ اگر کسی تخلیق کار کی دو یا دو سے زیادہ تخلیقات دی گئی ہیں تو طوالت کے پیشِ نظر صرف اہم تخلیقات کو زیرِ بحث لایا جائے گا۔

۹۔ پس منظری مطالعہ:

دورِ رواں تک بر صغیر پاک وہند میں متعدد ادبی رسائل شائع ہوئے۔ جنہیں اہم مدیران نے اپنی نگرانی سے جِلا بخشی۔ اردو ادب میں ان رسائل و جرائد کا جائزہ لیا جائے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان رسائل و جرائد کے معیار میں کمی آتی گئی۔ ابتدا میں جو رسائل معیار کے اوج کمال پر تھے آہستہ آہستہ وہ تنزلی کا شکار ہوتے گئے۔ دورِ قریب میں ایک وقت پر رسائل اور معیار کا تعلق بالکل ہی نہ ہونے کے مترادف رہ گیا۔ اسی صورت حال میں "ادبیات" اور" سیپ" امید کی نئی کرنیں دکھائی دیں۔ جو کسی حد تک مقدار کے ساتھ معیار کا تناسب لے کر منظر عام پر آئیں ۔ ان رسائل نے ادب کے ساتھ فنونِ لطیفہ کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ فنونِ لطیفہ ،ادب اور جمالیات کے تعلق کو جاننے کے لیے "فنونِ لطیفہ اور جمالیات "(محمد مظفر حسین)،"ادب میں جمالیاتی اقدار ایک مطالعہ (ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی)"اور" فنونِ لطیفہ (چند مضامین)"(راشد انور راشد) کا مطالعہ کیا گیا۔ علاوہ ازیں "مجلہ دستاویز" (عزیز نبیل) کی خصوصی اشاعت "اردو کے اہم ادبی رسائل و جرائد نمبر "اور "ڈاکٹر انور سدید" کی کتاب" پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ" کو بھی زیر مطالعہ لایا گیا ہے ۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت:

تحقیق حرکت و عمل و زندگی کی علامت ہے۔ اگر تحقیق رک جائے تو زندگی بھی رک جاتی ہے۔ تحقیق دراصل اس عمل کا نام ہے جس کے ذریعے مسائل کے قابلِ اعتبار حل تک پہنچنا ممکن ہے۔ اسی طرح ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے ادب کی سرحدیں لا محدود ہیں۔ ادب تین حرفوں کا مجموعہ ہے جو لا محیط ہے کوئی ادب کو سماج کا آئینہ قرار دیتا ہے تو کوئی دستورِ حیات۔ جب ادب کی شکل میں کوئی فن پارہ نثر یا نظم کی صورت میں لکھا جاتا ہے تو اسے تخلیق کہتے ہیں۔ تخلیق کے وجود میں آنے کے بعد ہی تحقیق اور تنقید کے مراحل پیش آتے ہیں یعنی ادب کی عمارت کے تین اہم ستون ہیں۔ تخلیق، تحقیق اور تنقید جن پر ادب کی عمارت کھڑی ہوتی ہے ان تینوں میں گہرا تعلق ہے۔ اور ادبی رسائل و جرائد نئی تخلیقات کو سامنے لانے کا اہم ذریعہ ہیں۔ تحقیق ادبی میدان میں ادیب، شاعر اور نقاد کے کارناموں پر روشن ڈالتی ہے۔ اور ان کے قدرو حیثیت کا تعین کرتی ہے۔ ہر ادبی دور میں ایک

تخلیقی فعالیت کا دور آتا ہے۔جس سے نئے لکھاری سامنے آتے ہیں۔ادبی رسائل و جرائد نئے لکھنے والوں کے لیے پلیٹ فارم مہیا کرتے ہیں۔ جس سے تخلیق کار کی صلاحیتوں میں نکھار آتا ہے۔

فائن آرٹس یا فنونِ لطیفہ کو کسی بھی انسانی سماج میں بہت اہمیت حاصل ہے کہ فنون لطیفہ لوگوں کو اپنے اندر کی آواز کو سُننے اور خود کو پہچاننے کا طریقہ سکھاتے ہیں۔ یہ فنون انسان میں چھپے دھندلے نقوش کو نمایاں کرتے ہیں۔ مجوزہ موضوع پر تحقیق سے ادبی رسائل کی فنونِ لطیفہ کے فروغ کے حوالے سے اہمیت واضح ہو گی نیز انسان، حسن جمال اور ادب کے تعلق کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

ب۔ بنیادی مباحث:

آج تک کسی قوم کا ایسا تاریخی سرمایہ یا ذخیرہ نہیں مل سکا جس سے انسانی جماعتوں کی ابتدائی رفتار یا حالات کی بنیاد پر ایسی روایات مل سکیں کہ جس سے مجموعی طور پر اقوام یا تمام انسانوں کا اتفاق ہو بالخصوص وہ روایات جو اس کی تخلیق سے متعلق ہیں ان پر بھی ایک خاص انداز سے گفتگو کی جاتی ہے-اور ان کو مانا جاتا اور ان پر استدلال کیا جاتا ہے–مثال کے طور پر

۱: داستانی رنگ میں

۲: مذہبی رنگ میں یا عقیدے کی بنیاد پر

۳: تاریخی رنگ میں

ان تینوں طریقوں کی روایات میں اگرچہ اختلافات بھی ہیں مگر بعض جگہوں پر ان میں اتفاق بھی دیکھنے کو ملتا ہے– مثال کے طور پر ایک قوم کے مذہبی رنگوں میں ایسے امور بھی نظر آتے ہیں جو تاریخ سے جا ملتے ہیں– اور بعض تاریخی روایات ایسی بھی ہیں جو کہ داستانی روایات سے ٹکراتی دکھائی دیتی ہیں–انسان کے علاوہ کوئی ایسی مخلوق نہیں جو اس سرگزشت کو تحریر کر سکے–یہی وجہ ہے کہ انسان نے اس سرگزشت کے بہت سے ورق خالی چھوڑ دیئے اگرچہ مذاہب نے مختلف امور پر روشنی ڈالی مگر انسانی علوم اور امور کی روشنی میں ایسا کوئی مصالحہ نہیں مل سکا جس سے استدلال کیا جاسکے کہ واقعی میں انسان کی شروع شروع میں حالت اور کیفیت کیا تھی؟

خود انسان کی پیدائشی بابت پر بھی مشاہیر اقوام میں اختلاف ہے–اس بات پر یقین کیا جا سکتا ہے کہ مذاہب نے انسان کی ابتداء کے متعلق الہامی رنگ میں کسی حد تک روشنی ڈالی لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان الہامی

روایات سے انسان کے ہر ابتدائی حصے کی ایک جھلک دیکھنے کو ملتی ہے- کیونکہ بعض مذہبی روایات یا مذہبی بیانات کی تصدیق ہم ہمیشہ عقیدے کے طور پر کرتے ہیں نہ کہ ایک محقق کے طور پر- بے شک بعض مقامات پر مذہبی روایات پر بھی محققانہ بحث دیکھنے کو ملتی ہے- مگر کسی حد تک ایک شخص یقینی طور پر ان کی نسبت رائے زنی کر سکے- کیونکہ معقولات میں تحقیقات کے بعض مراحل پر ٹھہرنا پڑتا ہے- اس طرح مذہبی امور میں بھی عقیدہ کی آڑ میں غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے اگر یہاں یہ سوال اٹھایا جائے کہ وہ کون سے قیاسات اور اجتہاد ہیں جو انسان نے شروع میں کیے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں ترقی ہوتی گئی ان کے بانی کون تھے؟ تو اس کا جواب انتہائی مشکل ہو گا- مثال کے طور پر اگر زبان ہی لی جائے تو ہم کبھی اس بات کا جواب نہیں دے سکتے کہ شروع میں کون سی زبان تھی؟ یا فلاں زبان کا بانی کون تھا؟ یا اس زبان کا بانی فلاں شخص ہے۔ اگرچہ بعض روایات اور قیاسات سے ہم کسی حد تک جواب دینے کے قابل ہو جاتے ہیں لیکن اس کا سو فیصد درست جواب دینا تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔

اسی طرح اگر یہ سوال کیا جائے کہ فنونِ لطیفہ کا بانی کون ہے؟ اور سب سے پہلے راگ کس نے ایجاد کیا؟ یا پہلا مصور، معمار یا سنگ تراش کون تھا؟ تو ان سب سوالوں کا بھی مکمل درست جواب دینا ممکن نہیں سچ تو یہ ہے کہ انسانی خیالات اور معلومات کے اعتبار سے ان سوالات کا جواب کبھی بھی ایک صورت میں نہیں دیا جا سکتا- کیونکہ ایسے جوابات کے ذرائع اور وسائل میں ہی اختلاف پایا جاتا ہے۔

یہ بحث چھوڑ کر کہ انسان کی ابتداء کیسی تھی؟ اور ابتدائی مراحل کون کون سے تھے؟ انسان کی کوشش اور دماغ سوزی سے اس وقت جتنا سرمایہ ہم تک پہنچ چکا ہے وہ بے بہا اور قیمتی ہے- جو کہ انسانی فہم و فراست اور اجتہاد کی عظمت کا زندہ ثبوت ہے- اور یہ سرمایہ کئی صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہے- جو کہ انسان کی مسلسل لگن اور کوشش سے ہم تک پہنچ سکا۔ یہ سرمایہ دو قسم کا ہے۔

۱: عملی سرمایہ

۲: علمی سرمایہ

علم مادہ ہے اور فن وہ ترکیب یا کیفیت جو مادہ میں پیدا کی جاتی ہے مثلاً کتاب کیا ہے؟ کاغذ، سیاہی اور الفاظ لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کی کیا قیمت ہے، یہ کتاب دکھاؤ یا یہ کتاب پڑھو، کوئی یہ نہیں کہتا کہ الفاظ، کاغذ یا

سیاہی کی کیا قیمت ہے؟ حالانکہ کتاب، الفاظ، سیاہی اور کاغذ کا مجموعہ ہے۔ مگر ایک خاص ترکیب سے گزرنے کے بعد ان تینوں کے مجموعے کو کتاب کا نام دیا گیا ہے- اور یہاں نام علم کی بنیاد پر نہیں دیا گیا بلکہ فن کی بنیاد پر دیا گیا ہے-

ڈاکٹر عابد علی عابد کے بقول:

"فطرت آرٹ کے خام مواد کی طرح ہے انسان اس خام مواد کو اپنے تخیل سے خوبصورت پیکروں میں ڈھال کر فنونِ لطیفہ کے نمونے پیش کرتا ہے"[۱]

یہاں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ قدرت میں انسان کے دخل کا نام فن ہے-

"مشاہدات، محسوسات، تخیلات کی کتر بیونت اور اختراعی صورتیں ایک فن ہے- مادہ کی ہیئت اور شکل میں تصرف کرنا ایک فن ہے-"[۲]

فن کیا ہے؟ قدرت ہے، قدرت کی نقل یا قدرت کا مخالف۔ جب انسان قدرت اور قدرتی مواد میں دخل اندازی کرتا ہے تو ایک مخصوص طریقے سے قدرت میں دخل دیتا ہے تو گویا وہ فن سے کام لیتا ہے- کسی بھی خوبصورت چیز کا دیکھنا، اسے محسوس کرنا اور اس کا اظہار کرنا فن کہلاتا ہے-

"انسانی جذبات، محسوسات، ضروریات کی تحدید، ترتیب ایک فن ہے- نئی شکلیں، نئی کیفیتیں، نئی حالتیں پیدا کرنا ایک فن ہے اور انہیں عملی رنگ میں لانا جو باعتبارِ تاثیرات اور جذبات کی خصوصیت رکھتی ہوں- ایک فن ہے نیچر اور قدرت نے جو کچھ ہمیں دیا ہے اس کو توڑ مڑوڑ کر اپنی ضروریات کے لائق بنانا ایک فن ہے- اشیاء، خیالات، جذبات کی خاص ترتیب، ترکیبِ اظہارِ ضبط کا نام فن ہے-"[۳]

فن کی تعریف اور فن کی اقدار کو جانچنے کے لیے فلسفے کی ایک نئی شاخ معراج کو پہنچی دکھائی دیتی ہے- جو کہ فن اور حسن کے تعلق پر مبنی ہے اسے جمالیات کہتے ہیں- جمالیات فلسفے کی وہ شاخ ہے جو حسن اور اس کے متعلقات پر بات کرتی ہے- جس کا منصب یہ تھا کہ فنونِ لطیفہ کی جانچ پڑتال کر کے ان اقدار کی نشاندہی کرے جنہیں کسوٹی تسلیم کیا جاسکے- ذوقِ سلیم سے بحث کرے- جمالیات کے ماہرین نے فنونِ لطیفہ اور جمالیات کو لازم وملزوم قرار دیا ہے- اور بعض مفکرین نے فنونِ لطیفہ اور جمالیات کو ایک ہی سکے کے دو رخ قرار دیئے ہیں۔

ا۔جمالیات، تعارف اور جہتیں:

اظہارِ حسن انسان کا ایک پسندیدہ عمل ہے۔ حسن کا اظہار کبھی انسان جان بوجھ کر کرتا ہے اور کبھی انجانے میں کرتا ہے۔

> "حسن کی کیفیت (objective) یعنی حسنِ معروض اور حسن کی کیفیت (subjective) یعنی حسنِ موضوع، ایک ہو جائے تو حسن کامل کا پیکر بنتا ہے۔ اور اصطلاح میں اسے جمال کی کلیت (totally) یعنی جمالیات (aesthetic) کہتے ہیں"[۴]

انسان اگر خوب غور و فکر سے اس کائنات کا مشاہدہ کرے تو اسے کائنات کی ہر شے خوبصورت نظر آئے گی اور اس بات کی وضاحت قرآنِ مجید میں بھی بڑے خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔

﴿الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ﴾ [۵]

یہاں اس بات کو ماننے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس جہاں میں موجود ہر شے حسین و جمیل ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر حسین شے ہر شخص کے لیے حسین نہیں ہوتی۔ ہر انسان کا ایک اپنا معیار ہے اور وہ اسی کے مطابق ہی حسن کو پرکھتا ہے۔ جب حسن کے معیار کو پرکھنے میں مشکلات درپیش آئیں تو حسن اور اس کے معیار سے متعلق مختلف نظریات نے جنم لینا شروع کر دیا اور آج سے قریباً دو سو سال پہلے سے آج تک مختلف اوقات میں لوگوں نے اس بارے میں مختلف نظریات پیش کیے۔

کروچے کے مطابق جمالیات ایک داخلی کیفیت کا نام ہے اور اس کا تعلق اظہارِ ذات سے ہے۔ ہیگل کے نزدیک حسن فطری عمل نہیں بلکہ ہر انسان کے تخیل کی دین ہے۔ بعض ماہرین حسن کو موضوعاتی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حسن انسان کے اندر بسا ہوا ہے۔ موضوعی نظریے کو ماننے والوں میں سرِ فہرست "پس ور" "رابرٹ وشر" ہیں ان کے مطابق اس جہاں کی ہر شے ذاتی طور پر نہ تو خوبصورت ہے اور نہ ہی بدصورت بلکہ یہ دیکھنے والی نظر کا کمال ہے جو اسے حسین یا قبیح بنا دیتی ہے اس کے برعکس معروضی نظریے کے علم برداروں کا کہنا ہے کہ حسن کے ادراک کے لیے کسی باطن طاقت کا ہونا ضروری نہیں۔

درج بالا نظریات حقیقتِ حسن کی مکمل ترجمانی نہیں کرسکتے اگر حسن کا تعلق صرف باطن سے ہوتا ہے تو پھر حسین شے کو دیکھ کر سب حسین کیوں کہتے ہیں۔ اگر حسن کے لیے کوئی باطنی قوت اہم نہیں ہے تو پھر باہر موجود حسن کا شعور کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ یہاں اس امر کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کائنات کی ہر شے حسین ہے اور توازن کی راہ نکالنے میں ہی بہتری ہے -دنیا میں موجود تمام اشیاء خوبصورت ہیں کیونکہ انسان کے شعور و ادراک کا صحیح توازن پیش کرتی ہیں-ارشادِ ربانی ہے۔

﴿وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا﴾ [۲]

"اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس میں صحیح توازن اور تناسب پیدا کیا"

حسن کو ظاہری شکل دینے کو فن کہتے ہیں اسی طرح جس کو درست توازن و تناسب میں پرکھنے کے فلسفے کو جمالیات کہا جاتا ہے -(۱۷۱۴ تا ۱۷۶۲) میں جرمن فلاسفر بام گارٹن نے سب سے پہلے فلسفہ حسن پر بات کی اور اس نے جمالیات کی اصطلاح استعمال کی۔

یونانی زبان کے ایک لفظ aisthe tickes سے مشتق جمالیاتی ادراک یا سمجھنے اور سوچنے کی حس جو کہ مرکب ہے حسن، خوشی اور تحسن سے۔aesthete کے لفظی معنی سمجھنے کے ہیں۔ ادراکِ حسن کی صلاحیت کی غیر موجودگی کو "anaesthesia" کہتے ہیں جبکہ aesthesia کا لفظ حسن کے احساس کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وہ سائنس یا فلسفہ جسکا واسطہ بنیادی طور پر حسن اور حسن کاری سے ہے اور جو حسن اور حسن کاری کے اصولوں اور نظریات کا تعین کرتا ہے اس کی بنیادی طور پر دو اقسام ہیں:

(۱) داخلی (۲) معروضی

داخلی قسم کا تعلق انسانی نفسیات سے ہے جس کے تحت جمالیاتی ذوق یا حسیات جمالیات کے محاکے کے مصدر اور ہیت معین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جبکہ دوسری قسم یعنی کے معروضی میں فطرت اور فن کے تعلق، فنونِ لطیفہ اور دیگر فنون کی تقسیم یا درجہ بندی نیز ان کا تعارف اور حدود وغیرہ کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔

"جمالیات فلسفہ ہے حسن اور فن کاری کا۔۔۔۔۔۔جمالیات سے مراد اربابِ فلسفہ کے وہ نظریات ہیں جو حسن اور اس کے کوائف و مظاہر (جن میں فنونِ لطیفہ بھی شامل ہیں) کی تحقیق و تشریح میں پیش کیے گئے ہیں "[۷]

صاحبزادہ حمید اللہ اپنی کتاب فن اور تکنیک میں لکھتے ہیں:

"جمالیاتی تنقید بھی سائینٹیفک تنقید ہے جس کی بنیادیں فلسفیانہ خیالات ہیں"[۸]

وسیع اور جامع معنوں میں مطالعہ حسن فلسفہ متعلق بہ حسن، فنونِ لطیفہ کا حسی اور جمالیاتی مطالعہ اور حسن کی تخلیق پر زور دینے والا فلسفہ، حسیاتِ انسانی کا مطالعہ جو کہ حسن کی تعین اور محسوسات کو بیان کرے حسن کا خارجی دنیا سے تعلق حسن کے ابلاغ کے ذرائع اور اثرات کسی فن پارے سے قاری کے ذہن پر ظہور پزیر ہونے والے اثرات اور فن کے دیگر بہت سے پہلوؤں کے احاطے کو جمالیات کہا جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ہیت اور خصوصیات کے لحاظ سے حسین و جمیل ہوں۔ جمالیات کا لفظ عربی زبان کے لفظ جمل سے نکلا ہے جس کے معانی حسین و جمیل کے ہیں جبکہ جمالیات کے لغوی معانی فلسفہ کی وہ شاخ ہی جس میں حسن اور لوازماتِ حسن پر بحث کی جاتی ہے مراد حسن بینی یا حسن شناسی ہے۔جمالیات کو ذوقیات اور حسیات کے معنوں میں بھی لیا جاتا ہے ۔حسیات کا ایسا علم جس کا اطلاق حواس پر کیا جائے اصطلاحاًوہ جو ہمیں ہر جگہ دکھائی دے اور خوبصورتی سے مراد وہ خوبصورتی جو ہمارے ذہن میں ہو یا جو ہمیں دکھائی دے۔

سیفٹری کے بقول:

"حسن ہم آہنگی اور مناسبت (ترتیب) کا نام ہے مناسبت اور ہم آہنگی میں حامل صداقت ہیں اور جہاں اجتماع حسن و صداقت ہو وہیں خیر ہے"[۹]

حسن پر تاثیر ہوتا ہے جو کہ خود بخود دوسرے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ احساس، جمال صرف ان افراد میں ہوتا ہے جو نرم مزاج، رومان پرور، تخیل پرست اور جذباتی ہوتے ہیں۔ جمالیاتی حسن کا ہر انسان میں ہونا ضروری نہیں جن لوگوں میں یہ حس موجود ہوتی ہے وہ دوسرے افراد سے مختلف ہوتے ہیں اور جمالیات کا تعلق کسی خاص خدوخال یا پیکر تک محدود نہیں بلکہ احساسِ جمال دلی جذبات، شیرنی بیانی، پڑھنے لکھنے، میٹھے لہجے، کام کے

انداز اور آسمان سے زمین تک کسی بھی جاندار یا بے جان میں پائے جا سکتے ہیں اور ان سب جاندار یا بے جان انسانی سوچ اشیاء یا خیالوں میں جادو ہوتا ہے جو انسان کو بے ساختہ اپنی طرف راغب کرتا ہے۔

دراصل حسن ایک احساس کا نام ہے اور حسن ہمیشہ توازن، ترتیب اور ہم آہنگی سے ترتیب پاتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک حسن منیر ہے جو ہمیشہ خوشی اور سکون کا باعث بنتا ہے۔ ہر وہ شے حسین ہے جو کہ مناسب ترتیب اور توازن میں ہے۔ حسِ جمالیات اجتماعی بھی ہو سکتی ہے اور انفرادی بھی لیکن ہر فرد کا مشاہدہ اور تجربہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی زیادہ محظوظ ہوتا ہے اور کوئی کم۔ کوئی حسین تصویر یا شاہکار کسی کے نظر و ذہن میں مدتوں بسا رہتا ہے اور کوئی اسی شاہکار کا برائے نام اثر لیتا ہے کیونکہ اس کی جمالیاتی حس پہلے شخص سے کم ہے یہ ہی وہ پہلو ہے جو کہ جمالیاتی دبستان کے وجود کا باعث بنے۔

جمالیاتی تنقید کا مقصد ادبی فن پاروں میں مسرت و حسن کے اجزاء تلاش کرنا۔ جمالیات ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی باقاعدہ تعریف کرنا انتہائی مشکل اور بے حد پیچیدہ ہے اور اس میں اتنی تہیں اور سمتیں پائی جاتی ہیں کہ اسے کھولنا اور بیان کرنا تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔ ہونارڈ، ارسطو، ہیگل، گروچے، بام گارٹن وغیرہ جیسے عظیم مفکرین اور فلسفیوں کے نظریات کی روشنی میں جمالیات کثیر الحیات کی صورت میں قدرت کے مظاہر کا مجموعہ ہے اور سمٹی ہوئی یکجا صورت میں خدا تعالیٰ کے مترادف ہے۔یعنی کہ جس کی جتنی بھی خوبیاں اور تعریف و تشریح کی جائے وہ کم ہے۔ جس سے اس دنیا اور اس دنیا میں میں موجود لوگوں کی اصلاح بھی روز بروز ہوتی جا رہی ہے اور اس کی نئی اقسام سامنے آ رہی ہیں۔

انسانی زندگی میں حسنِ اقدار کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے ان میں حسن کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور کوئی بھی شخص جمالیاتی حسن سے محروم نہیں ہوتا کسی میں جمالیاتی شعور زیادہ ہوتا ہے وہ اسی جمالیاتی شعور کی وجہ سے حسن کی تلاش میں لگا رہتا ہے۔ اس سفر میں جو چیز اس کے دل و نظر کو بھا جاتی ہے وہ اس پر "حسین" کا لیبل لگا دیتا ہے گر آج سے ہزاروں سال پہلے غاروں میں رہنے والے انسان کو دیکھا جائے تو وہ بھی جمالیاتی شعور سے عاری دکھائی نہیں دیتا۔ زندگی گزارنے اور اپنی حاجات کی تسکین کے لیے اس نے جو آلات و جواہر بنائے ان میں وقتاً فوقتاً ترامیم کرتا رہا ہے ان ترامیم کے نتیجے میں ان اشیاء میں مسلسل نکھار آتا رہا اور یہی نکھار اور خوبصورتی اس سے

مزید کچھ بہتر کرنے کی طرف لے کر جاتی ہے۔ نتیجتاً انسانی زندگی ترقی پذیر سے ترقی یافتہ میں بدلنے لگتی ہے۔ مجنوں گورکھپوری اس بارے میں لکھتا ہے۔

"آدم سے لے کر اس دم تک کوئی دور یا ملک ایسا نہیں ملتا جو حسن کے احساس سے بیگانہ ہو یا جس میں انسان نے حسن کے اثرات قبول نہ کیے ہوں اور حسن کا پتہ لگانے کی کوشش نہ کی ہو"[۱۰]

حسن اور اس کے بنیادی محرکات کی کھوج لگانے کی کوشش ہر دور میں انسان نے کی ہے اور یہ کھوج آج بھی جاری و ساری ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی بھی مکمل یقین کے ساتھ اس معاملے کو سلجھا نہیں سکا اور فلسفہ جمالیات اس معاملے کو حل کرنے کی ایک اہم اور سنجیدہ کوشش ہے۔

مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

"جمالیات سے مراد فلسفے کے وہ نظریے ہیں جو حسن اور اس کے کوائف و مظاہر کی تحقیق و تشریح میں پیش کیے گئے"[۱۱]

ڈاکٹر عبارت بریلوی کے بقول:

"جب تنقید کا رحجان فنی پہلوؤں کی طرف ہوتا ہے تو جمالیاتی تنقید کہلاتی ہے۔"[۱۲]

خاطر غزنوی اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

"جمالیاتی تنقید حسن پیدا کرنے والی خصوصیات کی تلاش کا نام ہے"[۱۳]

انسان کے اندر فطری طور پر ایک صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ وہ حسن اور قبیح میں فرق کر سکے اس قدرتی صلاحیت کو جمالیاتی حس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جمالیاتی حس انسان کو اچھے اور برے کی تمیز سکھاتی ہے اور جو شخص حسِ جمالیات سے عاری ہو یعنی کہ اس میں حسن اور قبیح کی تمیز کی صلاحیت نہ ہو اسے "حسن کور"(beauty blind) کہتے ہیں۔

"جمالیاتی تنقید کا کام ادبی تخلیقات کی جمالیاتی اقدار کو دیکھنا ہوتا ہے۔ جمالیاتی اقدار سے مراد وہ خصوصیت ہے جس کا وجود ہر فنی اور ادبی تخلیق میں موجود ہوتا ہے جو ان کو حسین بناتی ہے۔"[۱۴]

جمالیاتی تنقید میں یہ خوبی بھی پائی جاتی ہے کہ وہ فنی تخلیقات کو ادبی مقام دے کر انہیں نئی زندگی عطا کرتی ہے۔ ایک جمالیاتی تنقید نگار کو کسی بھی تخلیق کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اس تخلیق نے اس کے ذہن پر کس قسم کے اثرات مرتب کیے اور جو نقوش چھوڑے وہ مثبت تھے یا منفی۔ اور پھر وہ انہی نقوش و اثرات کی روشنی میں اس تخلیق کے مقام کا تعین کرتا ہے۔ مفکرینِ جمالیات میں جمالیاتی تنقید کے بڑے علم بردار والٹر پیٹر اس ضمن میں کہتے ہیں کہ جمالیاتی نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ جمالیاتی اثرات کے مآخذات کی وضاحت کرے اور ساتھ میں اس امر کی بھی وضاحت کرے کہ وہ کیسے معرضِ وجود میں آئے۔

ڈاکٹر نوازش علی کہتے ہیں کہ:

"فلسفہ جمالیات سے ادب میں دو نظریے سامنے آتے ہیں ان میں سے ایک اظہاری ہے اور دوسرا تاثراتی، تاثراتی دبستانوں کے نقادوں میں والٹر پیٹر کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کے نزدیک فن کسی اعلیٰ تر مقاصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ خود ایک مقصد ہے"[۱۵]

جدید تنقید نگاروں میں کروچے کے افکار نے جمالیاتی ادب پر گہرا اثر ڈالا۔ کروچے کو جمالیاتی تنقید میں اظہاریت (expression) کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں انہوں نے جمالیات میں نظریہ اظہار کو پیش کیا۔ آپ ۱۸۶۶ میں برطانیہ کے صوبہ الیکہ میں پیدا ہوئے۔ آپکو عالم جمالیات بھی کہا جاتا ہے۔ اور اظہاریت کا بانی بھی ۱۹۵۲ میں آپکا انتقال ہوا۔ بینیڈ ڈ کروچے کے نظریہ اظہار کو جمالیات میں بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"کروچے کا لفظ "اظہار" اس طرح اہمیت رکھتا ہے جس طرح ارسطو کا لفظ "نقل" کالرج کا لفظ "تخیل"، آرنلڈ کا تنقید "حیات" یا ٹالسٹائی کا لفظ "ابلاغ""[۱۶]

کروچے کو مفکرینِ جمالیات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اس کے فلسفہ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ "حقیقت" کا کوئی مفہوم نہیں۔ ہر وہ چیز جس کو انسان کا ذہن حقیقی تصور کرے وہ ہی حقیقت ہے علم کو بنیادی طور پر

دو صورتوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اوّل وجدانی دوم منطقی یعنی کے علم وجدانی تخیل اور منطقی علم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ کروچے کے نظریہ جمالیات میں وجدانیت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ کروچے کے نزدیک بہترین "اظہار" ہے یعنی کہ حسن کے اظہار کا انداز جتنا بہترین ہو گا اتنی ہی وہ حسین ہو گی اور وہ حسن کے اظہار میں ناکامی کو بدصورتی قرار دیتا ہے۔

"اس کا فلسفہ جمال یہی ہے کہ تمام تر تخیل آفرینی اور حسن کاری کو وجدانی تصورات کی دنیا میں خوب سے خوب تر دیکھا جائے "[۱۷]

کروچے نے تخلیقی عمل کو چار حصوں میں بیان کیا ہے:

۱: پہلے مرحلے میں فنکار تاثرات اخذ کرتا ہے یعنی کہ پہلی نظر میں اس شے نے اس کے ذہن پر کیا اثرات مرتب کیے۔

۲: دوسرے مرحلے میں تخیل میں حسن کی جمالیاتی ترکیب یا اس کا باقاعدہ اظہار کیا جاتا ہے۔

۳: تیسرے مرحلے میں حسن یا جمالیاتی ترکیب سے مسرت حاصل کرنا اور اس مسرت میں دوسروں کو بھی شامل کرنا۔

۴: چوتھے مرحلے میں تمام تاثرات اور حسن سے حاصل شدہ جمالیاتی ترتیب کو الفاظ، رنگ و آہنگ یا آواز کی صورت میں محفوظ کرنا۔

درج بالا کروچے کے چاروں مراحل کو تخلیقی عمل میں یکساں اہمیت حاصل ہے۔ لیکن کروچے نے بذاتِ خود دوسرے مرحلے کو زیادہ اہمیت دی کیونکہ خیال، سوچ، وجدان اور جمالیاتی ذوق کے ذریعے ہی تخلیق میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے نزدیک فن پارے کی تخلیق ہی سب کچھ ہے۔ کروچے نے فن اور ادب کو صرف وجدانی کیفیات کے اظہار کا نام دیا ہے اس لیے کسی تخلیق کی جمالیات عقلی تحلیل اور منطقی تجربہ کی گراں باری کے متحمل نہیں ہو سکتی۔ اگر فن کار حسن کے میدان میں کامیاب رہتا ہے تو اس سے قارئین خوشی محسوس کرتے ہیں لہذا تخلیق کے کامیاب اظہار کے لیے اس کا حسین ہونا بہت ضروری ہے۔ اس لیے اس نے کسی فن پارے کو پرکھنے کے لیے دو معیار قائم کیے ہیں کہ یا تو فن پارے دلکش اور حسین ہیں اس لیے کامیاب ہیں ورنہ اس کے متضاد یعنی کے بدصورت اور خراب ہیں اس لیے ناکام ہیں۔ وہ اپنے نظریہ فن کے بارے میں کہتا ہے۔

"عملِ تخلیق انسان کی مجموعی شخصیت کا وجدانی اظہار ہے-"[18]

جمالیات تنقید کے اجمالی جائزہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسے پائیدار اساس پر قائم کرنے کی کوشش نہ کی گئی اس کا کل اثاثہ وجدان، اساس، جمالیاتی حس اور تاثرات ہیں اور ان کے مفاہیم میں بھی یکسانیت نہیں پائی جاتی ہے-اس کے باوجود حسن کی جہات روز افزوں اپنے اندر وسعت اور گہرائی پیدا کرتی جارہی ہے-" جمالیاتی تنقید " فن اور حسن میں ایسی متنوع اور مختلف صورتوں میں بہت اچھی اور منفرد ہے- کسی ملک یا قوم کی روایت، تہذیب و تمدن کی ترقی اس قوم کے سوچ اور جمالیاتی حسن یا جمالیاتی شعور پر منحصر ہوتا ہے-

بنیادی طور پر مفکرین نے جمالیات کی تین صورتوں میں وضاحت کی ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ کسی چیز کو دیکھ کر اس سے لطف اٹھانا اسے پہلا احساس(sensation) کہا جاتا ہے-دوسری صورت میں کسی شے کو دیکھ کر کسی دوسری شے کا وجدان ہونا اسے احساسِ دوم (perception) کہتے ہیں- جبکہ تیسری صورت میں یہ کسی شے کو دیکھنے پر تخیل وجدان کے پورے سلسلے کو سامنے لے کر آنا، خوشی کی کیفیت دونوں صورتوں میں ہاتی ہے مگر دو مختلف کیفیات کی صورت میں جمالیاتی تنقید کی اہمیت عملی اور علمی دونوں صورتوں میں بہت زیادہ ہے . جمالیاتی تنقید سے انسان کے اندر کسی شے کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے-ایک ایسا فہم و شعور پیدا ہوتا ہے کہ وہ باطنی و ظاہری اور اجتماہی یا انفرادی ہر لحاظ سے حسن اور خوبی کا پیکر بن جاتا ہے اور جمالیاتی تنقید حسن پیدا کرنے والی خصوصیات کی تلاش کرتی ہے پھر ان خصوصیات کو پرکھتی ہے اور پرکھتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اس سے ذریعہ نہیں بلکہ نتیجہ اور مقصد معلوم ہو۔ والٹر پیٹر کا نام جمالیات کے بڑے بڑے مفکرین میں شامل ہے۔ وہ اس متعلق لکھتے ہیں کہ جمالیاتی نقاد کو کسی فنی یا ادبی تخلیق کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس تخلیق نے اس کے ذہن پر کیا نقوش چھوڑے ہیں؟ اور کیسے اثرات مرتب کیے ہیں؟ آیا یہ اثرات دوررس تھے یا وقتی؟ جمالیاتی نقاد کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ان سوالات کے جوابات فراہم کرے کہ ایک گیت، مجسمہ یا تصویر کیا ہے؟ یہ ہمارے لیے باعثِ مسرت و تسکین ہے اور اس سے حظ حاصل ہوتا ہے یا نہیں اگر ہاں تو اس کی نوعیت کس طرح کی ہے؟ اور اس نے انسانی فطرت پر کس قسم کے اثرات مرتب کیے ہیں؟ ان سب سوالوں کے جواب جمالیاتی نقاد فراہم کرتا ہے کیونکہ جمالیاتی نقاد کا بنیادی

مقصد ہی ہوتا ہے کہ وہ کسی ادبی یا فنی تخلیق میں اس پہلو کو سامنے لائے جو کہ اس کے لیے حسین کہلانے کی وجہ ہے اور کیا حسن ہی اس کی وجہِ دلچسپی ہے۔

۲۔ مشرقی جمالیاتی افکار کا جائزہ:

جمالیاتی تنقید کی بحثوں میں عموما مغربی افکار کا حوالہ دیا جاتا ہے اور حقیقیت بھی یہی ہے کہ جمالیات کی اصطلاح اور اس کے افکار و نظریات ہم تک مغرب کے سبب ہی پہنچے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ مددگار مغربی مفکرین کی کتب کے تراجم ہیں۔ آج کے دور میں قدیم فلسفہ اور ادب کے اثاثہ جات سے ایسے اجزاء کو تلاش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جن کو مغرب کے مقابلے میں پیش کیا جاسکے لیکن اس حقیقیت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ جمالیاتی ادب مغربی مفکرین ہی کی دین ہے ان کی بدولت ہی اس کی روشنی مشرق تک پہنچی اور اسی روشنی کے زیرِ اثر مشرق میں جمالیاتی ادب پروان چڑھا۔

قدیم مشرقی جمالیات کا سب سے اہم اور قابل قدر ذخیرہ قدیم برصغیر کے فلسفہ اور ادب میں دکھائی دیتا ہے۔ حال ہی میں برصغیر کی جمالیات پر اچھا خاصا کام ہوا ہے اور متعدد مفکرین نے قدیم سنسکرت ماٰخذ میں جمالیات اور فنونِ لطیفہ سے متعلق ایک مربوط اور منظم سلسلہ افکار کا سراغ لگایا اور ان کے مطابق فلسفہ جمالیات کا متعدد حصہ فنون کے اصول و ضوابط پر مشتمل ہے جو اس فلسفے کی تدوین کے زمانے تک ارتقاء کے مراحل سے گزر کر مکمل ہو چکے تھے۔

برصغیر میں فنونِ لطیفہ مغربی مفکر ہیگل کی پیش کردہ درجہ بندی کی رو سے علامتی اور اساطیری منزل کی جانب اشارہ کرتے نظر آتے ہیں یہاں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستانی جمالیاتی افکار اور فنونِ لطیفہ کا ارتقاء مذہب کے زیرِ سایہ ہوا اور اس میں مذہبی چھاپ کی واضح جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ مذہبی تصورات کی یہ گرفت اتنی ہمہ گیر اور دور رس تھی کہ اس کا اثر فنونِ لطیفہ کی باریکیوں تک میں دکھائی دیتا ہے اور علامتی اور اساطیری عناصر کی صلاحیت بھی برقرار رہی اس کے باوجود ہندوستانی فنونِ لطیفہ میں وہ تنوع اور پہلو داری نہ پیدا ہوسکی جو کہ کلاسیکی، یونانی مصر اور چین کے آرٹ میں دکھائی دیتی تھی۔

حیاتِ انسانی کے ارتقائی رحجان کے زیرِ اثر تخیل میں بنائے گئے پیکرِ خیالات کی دنیا سے تجربات کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں اور انسانی تجربات سے ہم آہنگی کے بعد فطرتِ انسانی کے تقاضوں پر پورا اترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب کا سارا ڈھانچہ انہیں تخیلات پر مشتمل نظر آتا ہے کہ یہاں فنون کی اساطیری روح ایک مستقل قدر کی حثیت حاصل کر چکی ہے اور اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی جمالیات میں فن کی معنویت ان علامات کے تابع نظر آتی ہے جنہیں فن میں بنیادی حیثیت حاصل تھی ہندوستانی جمالیات میں حقیقتِ جمال کے متعلق بحثیں بہت کم ملتی ہیں ابتداء میں ہندوستان میں جمالیات کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ہندوستانی فلسفہ کے دبستانوں کو قائم ہوئے ایک عرصہ گزرنے کے بعد جمالیات کی طرف توجہ مبذول کروانے کی کوشش کی گئی جبکہ فنونِ لطیفہ، موسیقی، ڈرامہ، رقص، شاعری، فنِ تعمیر اور سنگ تراشی اپنی منزل کی تکمیل کی طرف رواں دواں تھے اور اس عہد کو چوتھی صدی عیسوی سے دسویں صدی تک کے عرصے پر محیط بتایا جاتا ہے۔اس عہد کے مفکرین کے نزدیک فنونِ لطیفہ اور جمالیات کے بنیادی اصول جو "دیدوں" سے ماخوذ تھے اور عمومی طور پر ان اصول وضوابط کو دیوتاؤں اور دوسرے خداؤں سے منسوب کیا جاتا تھا ان کے مآخذ کیونکہ انسانی سوچ و بچار سے ماوراء تھے لہذا ان پر تنقید نہیں کی جاتی تھی ان کی صرف تعبیر و تفسیر کی اجازت تھی یا مختلف فن پاروں یا فنون میں مطابقت کی بنیاد پر ان کا تجزیہ کیا جاسکتا تھا تجزیہ کو اس وقت میں بہت اہمیت حاصل تھی اور اسے فن کی تکمیل کے لیے اہم جز تصور کیا جاتا تھا۔

اس وقت کے مفکرین و مصنفین کے سامنے بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ مختلف فنون میں حسن کے معیار کو کیسے پرکھا جائے؟ اور اس میں حسن کی نوعیت کو کیسے معلوم کیا جائے؟ اور اس کا اظہار کس طرح ممکن ہو؟ ان مختلف سوالات کے نتیجے میں مختلف فنون پر "اوامر و نواہی" (Do and Don’t) کی صورت میں تصنیفات سامنے آنا شروع ہو گئیں۔ ان رحجانات کے باعث جمالیاتی افکار معین حدود میں محصور ہو گئے اور فنون میں نئے تجربات کی راہیں تنگ ہونے لگیں اس کے نتیجے میں فنون میں انفرادی اسلوب کی جگہ طرزِ آفرینی (stylization) نے لے لی۔

ہندوستانی جمالیاتی مطالعہ میں فنون کے مدارج کو پیشِ نظر رکھا گیاہے اور ان فنون کو مرکزی اہمیت دی گی جو روحانی مسرت کا باعث بنتے ہیں اور ان فنون کو بنیادی طور پر تین اقسام میں بیان کیا گیاہے۔اوّل شاعری دوم موسیقی اور سوم فنِ تعمیر ۔ان فنون کے قواعد و ضوابط اور ہدایات کی صورت میں دیئے جاتے تھے ہر فن و تخلیقات اور تاثرات پر بحث کی جاتی تھی ان مباحث میں شاعری کو مرکزی حیثیت دی جاتی تھی بلکہ یوں کہاجائے توغلط نہیں ہو گا کہ شاعری کو قدیم ہندوستان میں تمام فنون پر فوقیت حاصل تھی۔

> "تیرہویں صدی عیسوی کے بعد ہمیں ہندوستان میں مسلم طرزِ تعمیر کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں بعد میں ایران اور ہندوستان میں تعمیر ہونے والی مسلم طرزِ تعمیر کی عمارات ایک بیش بہا خزانہ کی حیثیت رکھتی ہیں–شامی، مصری فنِ تعمیر، ہسپانوی، ایرانی، عثمانی اور ہندوستانی فنِ تعمیر کے ماہر برگز کے مطابق قرونِ وسط میں مساجد کی تعمیر ہوئی اور گنبد والی مساجد خاص طور پر مقبول ہوئیں"۱۹

انسانی ذہن کے وجدانی عمل کا الفاظ کی مدد سے بھرپور اظہار ہوتاہے اور یہ الفاظ ہی ہیں جن کی بدولت اس اظہار کو دوسروں تک پہنچایا جاتاہے–

قدیم ہندوستانی جمالیات میں اقدار، تناسب، توازن اور آہنگ وغیرہ کے بارے میں جو مختلف خیالات دیکھنے کو ملتے ہیں ان سے کہیں بھی اس بات کی وضاحت نہیں ہوتی کہ ان اقدار کا دوسری اخلاقی یا روحانی اقدار کے ساتھ کیا تعلق ہے جو ادب اور مذہب کے زیرِ سایہ پرورش پاتاہے۔وہ مذہبی، اخلاقی اور روحانی اثرات کے زیرِ اثر ضرور رہتاہے لہٰذا آرٹ اور ان کے لوازم کی بحثوں میں مذہبی عقائد وخیالات کا نمایاں اثر نظر آتاہے لیکن آرٹ کے مخصوص دائرہ عمل کا زندگی میں براہِ راست کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

> "اسلامی تعمیرات کے میدان میں مساجد کے بعد قصر اور محل کی تعمیرات بہت اہمیت رکھتی ہیں۔محلات کی تعمیر عالمِ اسلام میں ملوکیت کا نقطہ آغاز ہے– مسلم ماہرینِ تعمیر نے مفتوحہ اقوام سے تعمیری کام کے جو عناصر مستعار لیے ان کے بیش از بیش استعمال مسجد کی بہ نسبت محل کی تعمیرات میں ہوا– اس کی غالب وجہ یہ تھی کہ ان قوموں کا طرزِ تعمیر جس میں پیکر تراشی لازم جز تھی۔ایک ایسے مذہب کی عبادت گاہ کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا جس

کی اساس ہی وحدانیت پر رکھی گئی تھی-اس لیے مفتوحہ اقوام کے طرزِ تعمیر کے ایسے لوازمات جو اسلامی عبادت گاہ کے لیے ناشائستہ تھے محل کی تعمیرات میں زیادہ کھل کر سامنے آئے-"[۲۰]

قدیم ہندوستانی آرٹ میں حسن پرستی پر مشتمل نمونے پیش کیے جاتے تھے تو اعتراض پر یہ جواب ملتا کہ آرٹ کا مقصد کسی خاص عمل کی ترغیب دینا ہی نہیں ہے اور نہ کسی قسم کی نفرت و بیزاری پیدا کرنا ہے-بلکہ آرٹ حقیقتِ زندگی کے ہر پہلو کو سامنے لانے کا نام ہے۔ اور اس کا مقصد فرد کی توجہ حاصل کرنا ہے اور اس کے لیے مقدس اور غیر مقدس دونوں موضوعات اپنائے جاسکتے ہیں-

بر صغیر کی صدیوں کی تاریخ، تہذیب و ثقافت میں تخلیقی وقت کا ایک طویل اور حیرت انگیز تسلسل قائم رہا۔ عوامی رنگ، خیالات و افکار اور مختلف نسلوں کی تہذیب و ثقافت میں تخلیقی لمحات کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے تمام مادی و روحانی خیالات و تصورات میں تخلیقی لمحات کو محسوس کیا جاسکتا ہے-ہندوستانی فنون ہزاروں برسوں کے جمالیاتی تجربوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ تمام جمالیاتی تجربے جو تخلیقی لمحات کی دین ہیں ہندوستانی جمالیات کے اس سرسری جائزہ میں ان اصول و ضوابط کی تفصیل بے محل نظر آئے گی-راجہ بھوج، بھو بھوتی وغیرہ نے فنونِ لطیفہ خاص طور پر موسیقی، ڈرامہ اور شاعری کے بارے میں مختلف نظریات پیش کیے ہیں- مشرق میں جمالیاتی فکر و نظر، افکار و عقائد کا ایک اور سرچشمہ اسلام دورِ حکومت کے ادب میں دیکھنے کو ملتا ہے-اس ادبی سرمائے میں فنونِ لطیفہ کی اقسام، ماہیت کے بارے میں زیادہ وضاحت دیکھنے کو ہی ملتی۔

ہندوستانی فن کاروں کا جمالیاتی شعور، متحرک اور بیدار رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر عہد میں فنون کی جمالیاتی سطح بلند ہو رہی ہے اور فن کار کی تخلیقی صلاحیت اور تجربے کو بھی خاصی اہمیت حاصل رہی ہے- تخلیق محض کسی موضوع کا جمالیاتی عکس نہیں بلکہ جمالیاتی موضوع بھی ہے جمالیاتی صورت سماجی تجربے کو نسل در نسل آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتی ہے-

تخلیق کے رموز و اسرار کو سمجھنے کے لیے اور جاننے کے لیے جہاں خارجی حالات و واقعات پر نظر رہی ہے وہاں ہی داخلی اقدار و عناصر کا بھی گہرا شعور حاصل رہا ہے۔ خارجی اور داخلی اقدار و عناصر کی ہم آہنگی اور وحدت کے احساس نے انسان اور کائنات کے رشتوں کا عرفان عطا کیا۔ بر صغیر میں تخلیقی آرٹ کا رشتہ اپنی مٹی

اور تہذیب سے بہت گہرا رہا ہے۔ قدیم فنِ تعمیر، فنِ مجسمہ سازی، موسیقی اور مصوری وغیرہ سے گہرا لگاؤ اس مٹی کی اہم خاصیت دکھائی دیتی ہے۔

مشرقی سماج میں جسم، زمین، جنگل اور پرندوں کو ہمیشہ خاص نظر سے دیکھا جاتا رہا اور انہی کے ذریعے قدرت کو پہچاننے کی کوشش کی جاتی رہی اور ایک جمالیاتی وحدت کو محسوس کرنے کا شعور پیدا ہوا ہے۔ مختلف علاقوں کے عوامی جمالیاتی رحجان نے اس شعور کی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا۔ انسان کے جسم کو مٹی کے برتن سے تشبیہ دی گئ جس کی مضبوطی کے لیے اس کو آگ پر پکانا بہت ضروری ہے۔ وجود، ذات اور جسم کی حقیقت اور توانائی کو سمجھنے کے لیے ایک نازک اور دلکش پھول کنول کی علامت کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ کنول کا پھول جمالیاتی وحدت کا علامیہ کہلایا۔ مشرقی جمالیات میں وزن کو بہت اہمیت حاصل ہے اس لیے کہ اس کے تحرک سے زمان و مکان کی تسخیر ممکن ہے۔

ہندوستانی فنونِ لطیفہ کی روایات دنیا کی قدیم ترین اور منفرد فنی اور جمالیاتی روایات ہیں۔ جو ہر دور میں اپنی شادابی اور تازگی کی عمدہ مثالیں پیش کرتی ہیں۔ مشرقی جمالیات روایات کی پہچان تاریخی واقعات و اشیاء کے تسلسل میں ہوتی رہی ہے نئے موضوعات کے زیرِ نظر بھی اور اظہار کی مختلف صورتوں کے ساتھ کثرتِ حسن بھی دیکھنے کو ملتا ہے ہر سو وحدت کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ انسان اور فطرت، زمین اور انسان اور انسانی رشتوں نے مشرقی فنون کی جمالیات کو ایک عمدہ موضوع فراہم کیا۔

مشرقی جمالیاتی افکار کے سرسری جائزہ میں ہندوستانی جمالیات اقدار و افکار کی نمایاں جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کے علاوہ چینی تہذیب و ثقافت میں بھی جمالیاتی جھلک کی گہری چھاپ دیکھنے کو ملتی ہے۔ مشرقی جمالیات کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ یہاں جمال کی موضوعیت یا معروضیت کے متعلق کو اختلاف دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اور یہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مشرقی جمالیاتی مفکرین نے اس بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ جمال کی حقیقت کچھ بھی ہو وہ تصورِ جمال جس تک ہم فن کی بدولت پہنچتے ہیں وہ بیک وقت موضوعی بھی ہوتا ہے اور معروضی بھی اور حسن کے کسی ایک تصور یا معین تصور پر بات کرنے کے بجائے وہ مختلف تصورات یا رنگارنگ مظاہر میں اس کا مشاہدہ کرنے کے قابل نظر آتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہر فن کے مخصوص حسن اور اظہارِ حسن کے موزوں وسائل پر توجہ دی ہے مشرقی جمالیات میں یہ فکر بھی ملتی ہے کہ فنی حسن کا مطالعہ مختلف درجات پر کیا جاتا

ہے یا ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ فن کار تخلیقی عمل میں جس طرح اظہارِ حسن کرتا ہے اس کو دیکھنے یا سننے والے کے تجربات سے مختلف مانا گیا ہے یہ دوہرا تصور مشرقی جمالیات میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

قدیم ہندوستان کے فنون کا ثقافتی، مذہبی اور اجتماعی زندگی سے گہرا تعلق تھا اس لیے کسی بھی فن کی تشریح میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ فن کار اپنی تخلیق سے کس طرح کا تاثر پیش کرنا چاہا رہا ہے۔اور اس کی تخلیق سے ناظرین و سامعین کیا اثر لے رہے ہیں؟

فن اور فن کار کے جذباتی ردِ عمل میں فاصلے کے متعلق فکر کو بھی مشرقی جمالیات میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مغربی مفکرین کے نزدیک مشرقی جمالیات سے مراد احساس و جذبات کی تہذیب ہے یعنی کہ جذبات و احساس جو کسی فن میں دکھائی دیتے ہیں وہ خود کسی قدر کے حامل نہیں ہوتے بلکہ ان کی فن کی صورت میں پیش کش ان کو انفرادیت کی سطح سے بلند کر کے نفسیاتی فاصلے پر لاتی ہے اور ان کو براہِ راست محسوس کرنے کے بجائے تخیلی سطح پر لاتعلقی کے عالم میں توجہ کا موضوع بنایا جاتا ہے اور یہی غیر شخصی رجحان جمالیاتی نقاد کے تجربے کی بنیادی شرط ہے۔

مشرق میں جمالیاتی فلسفے اور فکر و نظر کا ایک اور پہلو اسلامی عہد کے متصوفانہ فلسفہ اور ادب میں نظر آتا ہے۔اس سرمایہ ادب میں فنونِ لطیف سے وہ معلومات و آگاہی نظر نہیں آتی جو یونان اور روم میں دیکھنے کو ملتی ہے اور اسلام میں بت گری اور مصوری کی ناپسندیدگی کی وجہ سے یہ فنون وجود میں نہ آسکے۔ مذہب اسلام کے ابتدائی وقت میں عربوں کا جمالیاتی شعور شاعری و موسیقی میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ خطاطی، فنِ تعمیر، سنگ تراشی اور نقاشی کے فنون میں بھی عربوں کو کمال حاصل تھا۔ مصوری سے عربوں کو شدید نفرت تھی اور وہ صورت گری سے ہر ممکن اجتناب کرتے تھے۔اور اس اجتناب اور عدم دلچسپی کو ان کے تمام فنون میں نمایاں دیکھا جا سکتا ہے۔ تعمیرات، پارچہ بافی، کوزہ گری، قالین سازی، نقش و نگار میں بھی تجریدی اشکال کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ مذہبی ناپسندیدگی اور بندشوں کے سبب انسانی اور حیوانی اشکال کو آرٹ میں جگہ نہ مل سکی۔ جبکہ مذہبی محبت کی وجہ سے خطاطی کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسلام میں فنونِ لطیف اور ان کے پھیلاؤ میں عربوں کے ساتھ ساتھ عجموں کا بھی بڑا حصہ ہے۔اور موجودہ دور میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی جو جھلک نظر آتی ہے یہ عربوں اور

عجموں کے ملاپ کی جھلک ہے۔ ابتدائی دور کے بعد جوں جوں وقت گزرتا گیا اسلام سے دوری اور عیاش پرستی کے سبب مصوری اور موسیقی کو بھی فروغ حاصل ہوا۔

تعیشات کی کثرت اور مذہب سے دوری صورت گری اور بت گری کے فنون میں اضافے کا سبب بنی مگر اس کے باوجود امراء اور عیاش پرست لوگوں کی سرپرستی فنِ موسیقی کو فروغ ملا۔ مگر صوفیہ کے بعض سلسلوں اور مذہبی اثر رسوخ کی بدولت ان فنون کے جمالیاتی پہلو پر لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ عملی اور اخلاقی تعلیمات اسلام کے زیرِ اثر جو رجحان قائم ہوا وہ موسیقی، اداکاری اور رقص جیسے فنون کے لیے موزوں نہیں تھا۔ کیونکہ یہ فنون اساطیری روایات اور مشرکانہ روایات کا سرمایہ سمجھے جاتے تھے۔

دینِ اسلام کے عروج کے دور میں فنونِ لطیفہ کے ارتقاء کے ساتھ ان کی تربیت و تعلیم پر بھی خاص توجہ دی جاتی رہی۔ اور یہ فنون صرف تجریدی آرٹ کی صورت میں دیکھنے کو ملے اور ان کے جمالیاتی پہلو میں کوئی خاص تحریری سرمایہ سامنے نہ آسکا۔ اسلامی معاشرے میں جب بادشاہی نظام نے فروغ پالیا تو سادہ اور مجاہدانہ زندگی کی جگہ تعیشات نے لے لی۔ روم اور ایران کے ثقافتی مظاہر شام، فلسطین، عراق اور ایران میں نظر آنے لگے۔ ان اثرات میں رقص اور موسیقی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ علماء اور مشائخ اس کے سخت مخالف تھے مگر مسلسل فتوحات اور دولت کی کثرت کے سبب ان فنون کے اثرات تیزی سے پھیلنے لگے۔ جانشینِ اسلام کی کوششوں سے بڑی حد تک اس رجحان کو کم کرنے کی کوشش کی گئی مگر اس کا مکمل سدِ باب ممکن نہ ہو سکا۔

صوفیائے کرام کی سرپرستی اور ذہنی رجحان کے باعث عوام کی کثیر تعداد ان فنون کے مخالف نظر آئی۔ اکثر صوفیہ کے نزدیک موسیقی کی اثر آفرینی مسلم رہی ہے۔ سماع کے حلال اور حرام ہونے پر علماء کا اختلاف آج تک برقرار ہے۔ بعض صوفیاء نے اسے جائز اور بعض صوفیاء نے اسے ناجائز اور بعض نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ اسی سبب تصوف کے بعض سلسلے (قادریہ، نقشبندیہ) نے اس سے پرہیز کو اولیٰ قرار دیا۔ اور جن سلسلوں نے اسے جائز سمجھا انہوں نے بھی سخت حدود و قیود کے بعد اس کی اجازت دی تاکہ ممکنہ مفاسد کا سدِ باب ہو سکے اس لیے صوفیاء کرام اور علماء نے جہاں جہاں بھی سماع کے بارے میں بات کی وہاں صرف اسی فنی پہلو کے بجائے اس کے آداب و قیود کو مرکزِ گفتگو رکھا تاکہ وہ جمالیاتی تاثر جو کہ اس کا مقصود ہے اگر ان حضرات کے نزدیک ایک حقیقت ہے لیکن اس کی وجدانیت کے متعلق نہ علمی انداز سے محاکمہ ممکن تھا اور نہ منطقی استدلال سے اس کے جواز یا عدم

جواز کے متعلق کوئی ثبوت فراہم کیا جاسکتا تھا۔اس کے برعکس شعبہ ادب میں صورتحال مختلف دکھائی دیتی ہے ۔عربوں کو شعر وادب سے گہرا لگاؤ تھا-اور عربی ادب میں شعری ادب کا بڑاذخیرہ دیکھنے کوملتاہے اس کے علاوہ تنقیدی معیاروں کی وضاحت حسن و صحیح کے معیار اور شاعری کے لوازم پر کثیر مواد موجود ہے اور اس تنقید کا بنیادی موضوع اس کا فنی پہلو یعنی کے اس کے قواعد، زبان اور لغات وغیرہ پر مشتمل ہے لیکن اس میں شعر کے جمالیاتی پہلو کو اجاگر نہ کیا جاسکا اور جمالیاتی بحث اس تنقید میں نمایاں نہ ہو سکی۔ یہاں اس بات سے یہ اندازہ لگانا کے اسلامی فلسفی، افکارو نظریات میں کوئی اہمیت حاصل نہیں۔اسلام کے افکار میں جہاں اسلامی نظامِ اقدار کے بارے میں تفصیل ملتی ہے وہاں ہی اسلام کا جمالیاتی تصور بھی زیرِ بحث رہا۔اسلام کے ارتقائی دور کو دین کے علمی اور فکری سرمائے کا دور تصور کیا جاتا ہے۔ جہاں پر دین کے عملی اور روایتی پہلو نمایاں نظر آتے ہیں۔اور ان میں اس پر دوسرے مذاہب اور تہذیبوں کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مذہبی رجحان میں تبدیلی کی جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے-یہی جھلک فنونِ لطیفہ کو سامنے لانے کا بڑا سبب بنی۔

اگر ہم اسلامی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ کریں تو ہم اس حقیقیت سے آشکار ہوتے ہیں کہ مسلمانوں نے شبہی اور تشبیہی فنون میں زیادہ دلچسپی نہیں لی بلکہ ان کی دلچسپی کو موضوع تنظیمی اور تعمیری فنون ہیں۔اور اس کی بڑی وجہ مذہبی جھکاؤ تھا۔ بعض علماء کے اختلاف کی وجہ سے تشبیہ نگاری کی ممانعت کے بعد اس طرف بھی مسلمانوں کا جھکاؤ کم ہو گیا اسی کا اثر تھا کہ مسلمانوں میں مجسمہ سازی کو بھی خاص توجہ نہ مل سکی اور ڈرامہ نگاری سے بھی اجتناب کیا گیا البتہ اسلامی دورِ حکومت میں تعمیرات اور خطاطی پر خاص توجہ دی گئ۔درحقیقیت مسلمان جن روایات میں گھرے ہوئے تھے ان میں زیادہ تر یونانی اور رومی افکارو روایات تھے اور ان روایات کو اپنانے کی اجازت مذہب میں نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں نے نہ صرف ان سے اجتناب کیا بلکہ اس کی بناء پر شبیہ اور بت گری سے بھی گریز کیا- مگر اس کے باوجود منفرد تعمیرات اور خطاطی کو اپنا کر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔

مسلمانوں کی فنی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا فن زیادہ تر کتاب، مسجد اور مقابر کے گرد گھومتا ہے اس کے علاوہ صرف فن کی صورت محلات، قلعے اور باغات میں نظر آتی ہے مگر وہ مقصدی ہے۔

مسلم تخلیق کار ہر فن و تخلیق میں ذاتِ باری کو تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے-اس کا ہر قدم ایک مذہبی جوش اور ولولے سے بڑھتا ہے وہ تلاشِ باری تعالیٰ میں اس کی رفعتوں اور وسعتوں کے نقوش بناتا ہے-لہذا اس کی تخلیقات مکمل نہیں بلکہ تکمیلِ آرزو کا اظہار ہیں۔اس لیے مسلم تہذیب و ثقافت میں تناسب اور موزونیت کے نمایاں اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے فنون میں مقصدیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے اور مسلمانوں کے زیادہ فنون کسی نہ کسی غرض سے وابستہ دکھائی دیتے ہیں۔

اسلام دیکھتے ہی دیکھتے مغرب و مشرق میں پھیلتا چلا گیا۔ جہاں جہاں اسلام کی روشنی پہنچی اس روشنی نے وہاں وہاں اپنے اثرات ثبت کئے لہذا دنیا کا کوئی بھی مذہب یا قوم ان اثرات سے خود کو بچا نہیں پایا- مسلمانوں میں نقاشی و سنگ تراشی ہر طرح کے لوگ شامل تھے گویا عقیدہ توحید کے جھنڈے تلے ایک مرکز میں اکھٹے تھے مگر مختلف خطوں اور رنگوں کے احساسات کو انہوں نے اپنے اندر زندہ رکھا ہوا تھا اور یہی احساسات اور رنگ نئے نئے فنون سے آشنائی کا سبب بنے مثال کے طور پر یہ زرفشانی کا آرٹ ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں میں مقبول ہوا۔ لوح سازی، نقاشی، خطاطی مسلمانوں کا قیمتی سرمایہ ہیں جبکہ دیگر فنون میں تجریدی آرٹ، کاغذ پر تصویر کشی کا آغاز بھی مسلمان تخلیق کاروں نے کیا۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ زندگی کے تمام پہلو کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس ضابطہ حیات کو باقاعدہ اصول و ضوابط کے ساتھ نافذ کیا گیا ہے۔ اس کے اصول و ضوابط کو اپنانے والے کو ہی نیکی اور خیر کی راہ دکھائی گئی ہے- اسلامی ضابطہ حیات میں فنون لطیفہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی مگر اسلام کے برعکس دیگر مذاہب میں بھی فنونِ لطیفہ کو کوئی مقام و مرتبہ حاصل نہیں تھا۔ مصوری اور بت گری کو مذہبی رجحان کی وجہ سے مقبولیت حاصل تھی جبکہ شاعری کی مناجات کی وجہ سے پسند کیا جاتا تھا۔

ہندوستان اور یونان میں مذہبی کہانیوں کی وجہ سے ڈرامہ کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی خاص طور پر یونان میں طربیہ اور المیہ دونوں طرح کے ڈرامے بادشاہوں کے دربار میں پیش کیے جاتے تھے مگر یہ ڈرامے زیادہ تر دیوتاؤں کی کہانیوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان میں مذہبی رنگ کی جھلک کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ یورپ اور دیگر غیر مسلم ممالک میں فنونِ لطیفہ کی تاریخ سے اگر مذہب کو نکال دیا جائے تو آدھے سے زائد تخلیقات سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ دوسری طرف اگر مسلم افکار کو دیکھا جائے تو یہاں بھی صوفیاء سے یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا کہ

سماع جائز ہے یا ناجائز؟ مصوری بھی سخت ناپسندیدہ تھی لہذا تخلیقانہ وجدان کی تسکین کے لیے مسلمانوں نے خوش نویسی کو ایک فن کی حیثیت دی۔

فن میں ایک مخصوص "غیر مذہبیت" پائی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر فن کار خدا اور تقدیر کو ہی ہدف بنا لیتا ہے۔ اس سے وہ آفاقیت وجود میں آتی ہے جس کی وجہ سے ایک فن پارہ ہر دور کے انسان کو معلوم ہوتا ہے اور ہر مذہب کے افراد میں اس کو برابر اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

دوسری طرف مذہبی موضوعات کو آرٹ سے نکالا بھی نہیں جا سکتا کیونکہ مذہب زندگی کی کل کا سب سے اہم اور بنیادی جز ہے لیکن صرف مذہب کو فنی شعور کا سرچشمہ قرار دینے سے قواعد و تکرار کی بناء پر ادب، ادب نہ رہے گا۔ موسیقی، موسیقی نہ رہے گی بلکہ سماع بن کر رہ جائے گی۔

برصغیر کے مسلم معاشرے میں فنونِ لطیفہ کے متعلق تضاد پایا جاتا تھا اسے امراء کے شوق اور عیاش پرستی سے تعبیر کیا جاتا تھا اور زیادہ تر تخلیقات بھی امراء کے پاس ہی موجود ہوتی تھیں۔ جبکہ کمزور اور نچلے طبقے کو کہا جاتا کہ فنونِ لطیفہ ابتذال، شرک اور معاشرتی و اخلاقی کا باعث ہیں۔ جبکہ اسلام نے جلال و کمال کا معیار پاکیزگی پر رکھا ہے۔ کسی بھی خس کو چھانٹا، پرکھا، جانچا پھر اس کو جمالیات کا ممتاز مقام و مرتبہ دیا۔ گویا اسلام دینِ فطرت ہے اور اس کی نظر صرف ظاہر پر نہیں بلکہ اصل اور باطن تک ہے۔

۳۔ جمالیاتی اردو ادب کی روایت:

مفکرین و مؤرخین نے جغرافیائی لحاظ سے دنیا کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے ان میں سے ایک حصہ کو مغرب اور دوسرے کو مشرق کہا جاتا ہے یہاں مغرب سے مراد براعظم یورپ لیا جاتا ہے جب کہ مشرق سے مراد براعظم ایشیا یعنی کے ان دونوں براعظموں کی تہذیب و ثقافت، رہن سہن اور زبان و مذہب وغیرہ۔ ایشیاء میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں سنسکرت، فارسی، عربی، ترکی، جاپانی اور اردو وغیرہ شامل ہیں اور جب بات کی جائے اردو تنقید کی تو اس میں عمومی طور پر سنسکرت، فارسی اور عربی زبانوں کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ ان میں فارسی اور عربی کو زیادہ اہمیت اس لیے دی جاتی ہے کیونکہ اردو کی زیادہ تر اصناف انہی زبانوں سے اردو میں آئی ہیں اور سنسکرت کو اس لیے شامل کیا گیا کیونکہ پراکرت اور دیگر زبانوں کے زیرِ اثر ہی اردو زبان پروان چڑھی۔

مشرقی زبانوں کا اگر بغور مشاہدہ کیا جائے تو یہ بات دیکھنے کو ملتی ہے کہ زمانہ قدیم سے یہاں کی زبانوں میں تنقید کا رواج چلا آرہا ہے۔

مشرقی تنقید کے متعلق عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ الفاظ کی چکا چوند، الفاظ کی ہیت اور شعر و سخن کے فنی محاسن سے تعلق رکھتی ہیں۔ مشرقی جمالیاتی تنقید بنیادی طور پر شے کے ظاہری حسن پر زور دیتی نظر آتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ جذبہ و احساس، اشارے، کنائے، محاورے، تشبیہ، استعارہ یعنی الفاظ کی قدر و قیمت کو سامنے رکھتے ہوئے فن پارے کا جائزہ لیتی ہے پھر فن پارے کے حسن و قبح کو پرکھتی ہے۔ اردو میں باقاعدہ تنقید نگاری کا آغاز مولانا الطاف حسن حالی کی کتاب مقدمہ شعر و شاعری سے ہوا جو کہ ۱۸۹۳ میں شائع ہوئی اگرچہ تنقید اس سے پہلے بھی ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں مگر اس سے پہلے تنقید کو مرتب کرنے کا رواج نہ تھا۔ دکن کے شعراء جن میں سرِفہرست ملا اسد علی وجہی جس نے باضابطہ طور پر اپنی کتاب "قطبِ مشتری" میں تنقیدی خیالات کا اظہار کیا اور شاعری میں نزاکت، سادگی، معنی آفرینی اور اچھے الفاظ کے استعمال پر زور دیا۔ ان کے علاوہ دیگر شعراء جن میں میر تقی میر، سودا، مصحفی، انشاء، انیس، غالب، اقبال اور میر حسن شامل ہیں ان کے کلام میں بھی تنقیدی نظریات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کسی بھی شعر یا شاعری کے مجموعے کو پرکھنے کے لیے عمومی طور پر جمالیات تنقید کا سہارا لیا جاتا تھا- اور اس کے ذریعے ہی اشعار میں حسن و قبح کی تمیز کی جاتی تھی۔

اردو میں جمالیات کے ارتقاء میں "تقریظ" کو بہت اہمیت حاصل ہے- تقریظ سے مراد تعریف کرنا یا مدح کے ہیں۔ عربی میں تفریظ کو تنقید کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے- جبکہ اردو میں اس سے مراد کتابوں پر تعریفی کلمات کی تحریر ہے۔ شروع شروع میں تقریظ میں صرف تعریفی کلمات کا اندراج ہوتا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نقادوں نے اس میں تحریر کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کی بھی نشاندہی کرنا شروع کی۔ مثال کے طور پر غالب نے سر سید احمد خان کی کتاب "آئینِ اکبری" کی تقریظ لکھتے ہوئے اس کتاب میں موجود اغلاط اور نقائص کی بھی نشاندہی کی- اس لیے ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں جمالیاتی تنقید کے ارتقاء میں تفریظ نے اہم کردار ادا کیا- اور جمالیاتی تنقید کو اس کی منزل کی جانب رواں دواں کرنے کے لیے سیڑھی کا کردار ادا کیا۔

اردو میں جمالیاتی تنقید کے اولین نمونے اردو کے نامور شعراء کے تذکروں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان تذکروں کے مطالعے سے یہ اندازہ لگایا جاتا رہا ہے کہ یہ تنقید یا تو تاثراتی ہے یا پھر عروضی- بعض لوگ جمالیاتی

تنقید اور تاثراتی تنقید کو ایک ہی چیز خیال کرتے ہیں لیکن حقیقت اس کے بر عکس ہے کیونکہ دونوں میں کچھ خصوصیات مشترک ضرور ہیں مگر دونوں میں فن پارے کو پرکھنے کا طریقہ مختلف ہے۔ تاثراتی اور جمالیاتی تنقید میں تاثرات کی وجہ سے دونوں کو ایک جیسا تصور کیا جانے لگا لیکن دونوں میں فرق اتنا ہے کہ تاثراتی تنقید ادب کے ایک ایک پہلو کا مطالعہ کرتی ہے اور فقط اس بات پر اکتفا کرتی ہے کی کسی فن پارے سے ذہن پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ اگر فن پارے کو دیکھنے سے خوشگوار اثرات مرتب ہوں تو وہ فن پارہ قابلِ قدر ہے ورنہ نہیں جبکہ جمالیاتی تنقید میں صرف تاثرات ہی سب کچھ نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔

بنیادی طور پر تنقید کا مقصد کسی تخلیق کار کی اغلاط کی نشاندہی نہیں بلکہ تنقید ایک تعمیری شے کی مانند ہے- ادب کے پھلنے پھولنے میں تنقید کا بڑا ہاتھ ہے- اور تنقید ادبی تعمیر و ترقی کے لیے انتہائی ضروری اور اہم ہے- تنقید ادب میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے- جتنی بنیاد مضبوط ہو گی اتنی ہی ادبی تعمیر اچھی اور پائیدار ہو گی- تنقید کی ادب کے لیے وہ ہی حیثیت ہے جو کہ ایک چمن کے لیے باغبان کی ہوتی ہے- ادب اور آرٹ کے شاہکاروں کو پرکھنے، جانچنے اور ان کی قدر و قیمت کا پتہ لگانے اور اس کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرنے کا نام ہی تنقید ہے۔ انسان کی ابتداء سے انتہاء تک تنقیدی کام ہو تا رہا ہے اور ہو تا رہے گا۔

ج۔ جمالیاتی تنقید اور فنون لطیفہ کی روایت:

جمال اور جمالیات دو ایسی اصطلاحات ہیں جو کہ عموماً مختلف کتب یا رسائل و جرائد میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ عوام و خواص کا ایک بڑا حصہ انہیں مترادف خیال کرتا ہے۔ الفاظ اور صورت میں مناسبت کے باوجود بھی ان دونوں میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ آسان الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جمال حسن ہے اور جمالیات حسن کا فلسفہ۔

انسانی زندگی میں جن روایات و اقدار کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے ان میں ایک اہم قدر حسن ہے- حسن کو دیکھنا اس سے مسرت حاصل کرنا ہر دور کے انسان کا اہم مشغلہ رہا ہے۔ ہر شخص میں تھوڑا بہت جمالیاتی شعور لازمی ہو تا ہے اور یہ جمالیاتی شعور اسے مزید بہتر کی تلاش میں لگائے رکھتا ہے وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے اسے محسوس کرتا ہے پھر جہاں اس کی نظر ٹھہر جاتی ہے وہ اسے دوبارہ دیکھنے کی جستجو کرتا ہے یہی چیز حسن ہے۔

آغاز سے لے کر آج تک کوئی بھی شخص ایسا نہیں جو جمالیاتی شعور سے عاری ہو- مثال کے طور پر ابتداء کے دور کے انسان نے اپنے استعمال کے لیے جو اشیاء (برتن، گھر) تیار کیں ان کو وقت کے ساتھ ساتھ بہتر کرنے کی کوشش کر تا رہا-

پروفیسر قیصر الاسلام رقمطراز ہیں:

"انسان میں پیدائشی طور پر حسن کے مظاہر کو قبول کرنے کا رجحان موجود ہے- اشیاء میں ان کی خوبیوں کے وہ خواص جو ہم میں لذت و سرور کی ایک خاص کیفیت کو جنم دیتے ہیں دراصل حسن کہلاتے ہیں اور اس علم کو ہم جمالیات کا نام دیتے ہیں"[۲۱]

بیسویں صدی کے اوائل میں موسیقاروں، شاعروں اور فنکاروں نے فن اور جمالیات کے دائرہ کار کو وسیع کرتے ہوئے خوبصورتی کے موجودہ تصورات کو چیلنج کیا۔ ۱۹۴۱ میں امریکی فلسفی اور شاعر "ایلی سیگل" نے جمالیاتی حقیقت پسندی کی بنیاد رکھی اور یہ کہا کہ دنیا اور فن خود ایک دوسرے کی وضاحت کرتے ہیں۔

مابعد جدید جمالیات کی تعریف کے لیے مختلف کوششیں کی گئیں نیز اس حقیقیت سے انکار کرنا کہ حسن جمالیات اور آرٹ میں مرکزی اہمیت رکھتا ہے لیکن در حقیقت پرانا جمالیاتی نظریہ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ارسطو مغربی ادب میں وہ پہلا شخص سمجھا جاتا ہے جس نے اپنے نظریات میں خوبصورتی کی اقسام کو بیان کیا- ارسطو کا تعلق یونان سے تھا اور جمالیات کا آغاز بھی یونان سے ہوا۔ یونان کے مفکرین نے سب سے پہلے فلسفے کی تین اہم شاخوں میں جمالیات کی جھلکیاں دکھائیں جن میں علمِ کائنات (cosmology) نفسیات اور امدادی افعال انسان کا نظریہ (theory of purposive human activity) کے دائروں سے نکل کر حسن کی مابعد طبعیات صورت اختیار کر کے اپنی ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی۔

ادب کے فنی اقدار کی جانچ پڑتال کے لیے جمالیات کو دیکھنا بہت ضروری ہے- تنقید اور جمالیات کا آپس میں گہرا تعلق ہے ان دونوں کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا۔ آغاز میں جمالیات میں یا تو حسن و دلکشی کی طرف روح کی رغبت کو بیان کیا جاتا تھا یا پھر انسان کی بنائی ہوئی حسین چیزوں کے متعلق مختلف نظریات قائم کیے جاتے تھے- بعد ازاں ان نظریات پر غور و فکر کر کے ان کو با قاعدہ پیش بھی کیا جاتا تھا- یہی وہ دور تھا جب جمالیات کا بیج پھوٹا، پھیلا اور بڑھا۔ پھر گزرتے وقت کے ساتھ اس میں اضافہ اور ترامیم ہوتی

رہیں اور اس نے با قاعدہ فلسفے کی شکل اختیار کر لی جس کو مفکرین نے خاصی پذیرائی بھی دی اور با قاعدہ حسن کے متعلق غور و فکر کے فلسفے کا نام دیا۔ کروچے کے "اظہار" کو مرکزی اہمیت حاصل ہے ۔ اس کے خیال میں خوبصورتی صرف اسی وقت خوبصورت ہے جب اس کا اظہار کیا جا سکے۔ مارشل میک نویسن کے خیال میں آرٹ ہمیشہ ایک مقابلے کے ماحول میں کام کرتا ہے جو معاشرے کے بارے میں عام طور پر پوشیدہ چیز کو ڈیزائن کیا جاتا ہے۔

لون جائی نس جس کے زمانے کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے تیسری یا چوتھی عیسوی کا فلسفی تھا- یونانی روایات سے براہِ راست متاثر تھا اس کے مطابق ادب خوشی اور مسرت کا ذریعہ ہے۔ ادب کے اس اثر کو مدِ نظر رکھ کر یہ مصنف اور قاری پر ادب کے اثرات کی وضاحت بھی کرتا ہے-

بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ:

> "لون جائی نس کا خیال ہے کہ ادب کی سب سے بڑی خوبی یا صفت جو قاری پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے ارفعیت ہے- اور خیالات کا شرف (nobility) اور اسلوب کا شکوہ (grandeur) اس میں بطور اجزاء شامل ہیں-"[۲۲]

ڈاکٹر سلیم اختر اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "ڈیموکرائیٹس پہلا فلاسفر ہے جس کے اقوال میں جمالیات کے اشارات ملتے ہیں لیکن اس کے افکار میں جمالیات کو اساسی اہمیت حاصل نہ تھی اس لیے اس نے جمالیات کو منضبط طریقے سے پیش کرنے کی کوشش نہ کی یہ تو افلاطون تھا جس نے اس کی باضابطہ حیثیت متعین کی ۔ جمہوریہ اور پیدریوس میں اس نے جمالیات کے اصول و قوانین کو مدون کیا ۔۔۔۔ افلاطون کا کہنا ہے کہ اس نامکمل کائنات میں حسن و جمال کی اصل اور مکمل حالت نہیں مل سکتی کیونکہ یہ تو "ظل" ہے اس حسن کا جو مستور ہے - پلاطینوس نے افلاطون کے تصورِ حسن کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا ۔ اس کے نزدیک اس عالم آب و گل میں آنے سے پہلے آسمانوں پر "ازلی حسن" کی جھلکیاں دیکھیں وہ ہمیشہ اس کے لیے اس کی روح کی گہرائیوں

میں جذب ہو کر رہ گئیں۔۔۔۔۔اس لیے وہ انسان مسلسل دنیا میں اس ازلی حسن کی تلاش

میں سر گرداں ہے۔"[۲۳]

جمالیاتی تنقید کا آغاز بقراط، سقراط، ارسطو اور افلاطون کے دور میں ہوا۔ انھوں نے با قاعدہ جمالیات پر بحث کی اور اس کے حق میں دلائل دیئے لیکن جمالیاتی تنقید کو با قاعدہ طور پر تقریباً تین سو سال پہلے ایک برطانوی فلاسفر اور مفکر "بام گارٹن" نے متعارف کروایا۔ انہوں نے اپنی ابتدائی کتب میں مبہم انداز میں جمالیات کو زیرِ بحث لایا۔ سب سے پہلے بام گارٹن نے اپنے مقالے میں جمالیاتی تصورات کے اشارے دیے۔ بعد ازاں ۱۷۳۷ میں با قاعدہ طور پر جمالیات کی اصطلاح پیش کی اور عام لوگوں تک اس اصطلاح کو پہنچایا۔

ا۔جمالیاتی تنقید اور فنونِ لطیفہ:

فن کے لغوی معنی ہیں قدر کرنے والا یا کمال ہنر مندی کو پہنچانے والا۔ فن کی جمع فنون ہے لطیفہ سے مراد ایسا فن جس میں لطافت پائی جائے یعنی وہ فنون، جو انسان کی جمالیاتی حس کو تسکین کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ کی پانچ اقسام ہیں–شاعری، موسیقی، خطاطی، سنگ تراشی اور مصوری

اگرچہ یہ پانچوں فنون ایک دوسرے سے جدا معلوم ہوتے ہیں اور عمومی طور پر ان میں سے کسی ایک کا ذکر کیا جاتا ہے- تو دوسرے کا ذکر لازم نہیں ہوتا تو کوئی شخص شاعری کے ذکر سے مصوری یا موسیقی کا خیال ذہن میں نہیں لا سکتا نہ ہی موسیقار کو مصور یا شاعر کو موسیقار یا سنگ تراش کہا جا سکتا ہے-لیکن غور کرنے سے یہ حقیقت دیکھنے کو ملتی ہے کہ ان پانچوں فنون میں ایک ہی نسبت ہے اور ان فنون کا تصور اور تخیل ایک ہی اصول کے ماتحت اور ایک ہی سوچ کا حامل دکھائی دیتا ہے ان کی بنیاد ایک ہی فکر یا خیال پر ہے یعنی ان کا بنیادی مادہ فطرت نے ایک جیسا رکھا ہے۔

فن اور فن کار کا خالق ایک ہی ہے-لہذا ہر فن کار کی سوچ کا زاویہ کہیں نہ کہیں جا کر ملتا ہے۔ اگرچہ ہر طبعیت اور ہر انسان میں کسی حد تک ایک رہبر کا نشان ملتا ہے لیکن کمال کا درجہ حاصل کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں جن لوگوں کی فطرتیں ایسے امور اور کمالات کی خاصیت رکھتی ہیں وہ اس فن کے جہاں میں آتے ہیں اور اسے آباد کرتے ہیں۔ ہر انسان اپنی ذات میں کسی نہ کسی حد تک فلسفی کا درجہ رکھتا ہے لیکن فلسفے کا حقیقی شعور بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے- مثال کے طور پر ریاضی بہت سے لوگ جانتے ہیں اور بہت سے مختلف

مراحل میں اس کے امتحانات بھی دیتے ہیں۔ مگر ایسے افراد بہت کم مقدار میں سامنے آتے ہیں جنھیں ریاضی میں مہارت حاصل ہوتی ہے۔

ہر انسان کسی نہ کسی رنگ میں شاعری کرتا دکھائی دیتا ہے-چاہے اسے علمِ عروض کی ذرہ سوجھ بوجھ نہ ہو لیکن سو شاعروں میں بمشکل دو شاعر ہی ایسے ہوتے ہیں جنھیں اپنے فن میں مہارت حاصل ہوتی ہے-ایک شخص جھونپڑی بنا کر اپنی سانسیں پوری کرتا ہے موسموں کی سختی میں اسے وہ کٹیا محل کی مانند دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح ہر شخص آرام کرنے کے لیے اپنے گھر کی تلاش کرتا ہے یہاں جھونپڑی بنانے والے کو فنِ تعمیرات کا ماہر نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس کی تعمیرات ضرورت پر مبنی ہیں۔ یہاں اسے فنِ تعمیر کی خوبیوں اور خامیوں کا کوئی اندازہ نہیں۔ فنونِ لطیفہ کا مواد قدرتی طور پر طبعیت میں رکھا ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی طریقے سے فن کا شوق رکھتا ہے یا فن کار ہے-فنونِ لطیفہ کی کوئی بھی قسم ہو اس کی طبعیت میں ولولہ اور شوق پایا جاتا ہے۔ اگرچہ ہر شخص کو اس پر مکمل عبور حاصل نہیں ہوتا پھر بھی کسی حد تک وہ اس کا شغف ضرور رکھتا ہے۔

فنون کو سیکھ کر ذوق و دلچسپی سے آگے بڑھایا جائے تو یہ فنون انسانی شخصیت میں عمدگی اور نفاست کا باعث بنتے ہیں۔ فنون میں اصولِ نظم کی اہمیت سے کسی صورت انکار ممکن نہیں جب تک نظمیت نہ ہو یا اصولِ نظم پر عمل نہ کیا جائے تب تک فنون میں ان کی حقیقی روح نہیں پھونکی جاسکتی۔

حسن کا اپنا ایک فلسفہ اور سائنس ہے-یعنی کسی شے کا کمال یا حسن کا کمال من حیث سائنس بھی ثابت ہے-اور من جہتِ فلسفہ سائنس بھی- حسن کے فلسفے کو جاننا یا کمالِ حسن کے متعلق آگہی حاصل کرنا اور کمالِ حسن کو پانے والا اس کی فلاسفی تک پہنچ جاتا ہے-مجموعی طور پر فلسفہ کی تعریف فراست و محبت یعنی(wisdom of love) کی جاتی ہے-جبکہ حسن و جمال کے فلسفہ تناسبات محبت (proportions’ of love)ہے-یعنی کہ ان معنوں میں فلسفہ وہ ہے جو اعلیٰ تناسبات سے محبت رکھتا ہو گا وہ حسن سے بھی محبت رکھتا ہے۔ محبت و فراست ایک اہم اور عظیم مرحلہ ہے لیکن کمالِ محبت اس سے بھی زیادہ وسیع ہے-اور کمالِ فراست کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے کیونکہ جب تک انسان میں فراست اور ذہانت نہیں ہو گی اس کمالِ محبت کا مادہ جنم نہیں لے سکے گا-کسی شے کی خوبصورتی دیکھ کر اسے سراہنا اور اس کی قدر کرنا وہ فراست ہے جو ہر کسی میں نہیں پائی جاتی بلکہ صرف ان کو حاصل ہوتی ہے جو حسِ لطیف کی دولت سے مالامال ہوتے ہیں۔ دیدہ

بینار کھتے ہیں جو شخص کمال حسن کو اہمیت نہیں دیتا اور حسین شے کی قدر نہیں کر تا وہ فراست کی بھی قدر نہیں کر تا۔

حسن کی سائنس کیا ہے ؟ حسن کے کمال کے اسباب جاننا ان میں موجود نسبتوں سے آگاہی حاصل کرنا اور اسی مطابقت سے ان نتائج کو نکالنا جو کہ مخفی ہیں اور عملی زندگی میں حسن اور اس کے کمالات کی نسبتوں کو دیکھانا اور اس سے کمالات کی نئی بنیاد ڈالنا ایک سائنس ہے -فنونِ لطیفہ (شاعری اور مصوری) میں نکات کا شعور اور ان کی ترتیب و تنظیم ایک سائنس ہے -اور اسی کی بدولت ان میں حسن و دلکشی پیدا ہوتی ہے -سائنس میں تجربہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جبکہ فنونِ لطیفہ میں تجربات سے خوبیاں سامنے آتی ہیں-تمام فنونِ لطیفہ میں جو کچھ کمال پایا جاتا ہے اور حسن کی جو بھی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے وہ سائنس آف بیوٹی کی دین ہے-کیونکہ حسن کو بذاتِ خود ثبات نہیں حسن کی سائنس کی بدولت اس میں کسی حد تک ثبات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے-مصوری میں مصوروں نے جو خوبیاں، کمال اور جو عمدگیاں پیدا کرنے کی کوشش کیں وہ حسنِ سائنس کی بدولت ہی ہیں سائنسِ حسن کی بدولت ہی یہ دنیا اس کی چکاچوند اور دلکشی قائم و دائم ہے۔

جمالیات کو حسن کی سائنس یا فلسفے کا ایک پہلو قرار دیا جاتا ہے- ارسطو اور دیگر مفکرین نے اسے حسن، حسن کی ماہیت و فطرت اور فنونِ لطیفہ سے قریب تر تصور کیا ہے۔ فن کارانہ تجربات کو جمالیاتی تجربات قرار دیا اور اسی سبب جمالیات کے باطن سے سوالات ابھرنے لگے جن کا تعلق فنونِ لطیفہ، حسن کاریوں اور تخلیقی عمل سے تھا-لیونارڈ کے مطابق فطرت کے جلال و جمال اور فنون کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے جمالیات کا سہارا ضروری ہے-بو آئیلو(Boileau) نے تخلیقی فن کے معیار کو پرکھنے کے لیے جمالیات کا سہارا لیا- ہیگل کے مطابق جمالیات زندگی اور آرٹ کو سمجھنے کا ذریعہ ہے۔

جمالیات کی اصطلاح انتہائی معنی خیز ہے اور فنونِ لطیفہ کی معنویت اس میں چھپی ہوئی ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فنونِ لطیفہ جمالیات ہی کی دین ہے کیونکہ جمالیات کی بدولت ہی تجربات کو فنی تجربات میں تبدیل کیا جاتا ہے اور فکر و نظر کی تخلیق کی بنیادی وجہ جمالیات ہی ہے-اس کی بدولت فنکار کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہوتا ہے-

ماہرین جمالیات کہتے ہیں کہ مناظرِ کائنات یا فنونِ لطیفہ کے کسی بھی حصے تک رسائی یا اس کے اصل جواہر کی دریافت جمالیات کے بغیر ناممکن ہے۔ مفکرین کی رائے میں کسی بھی فن پارے یا تخلیق کا اصل جوہر اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یعنی جمالیات کی مدد سے اللہ تعالیٰ اور اس کے جلال و جمال کو بھی دریافت کیا جا سکتا ہے۔

آرٹ اور ادب کی تخلیق میں اساطیر کو بھی بنیادی اہمیت حاصل ہے کیونکہ لطیف ادب کی تخلیق میں کہیں نہ کہیں شعوری یا لاشعوری طور پر اساطیر کے اثرات شامل ہوتے ہیں۔شکیل الرحمن کے مطابق اساطیری کردار اور روایت فن کار یا تخلیق کار کے لاشعور کے کسی پردے میں ہوتے ہیں اور یہ اساطیر کی لہریں نسلی شعور سے نامحسوس طریقے سے آتی ہیں ااور شعور پر اثر انداز ہوتی ہیں لہذا کوئی بھی بڑا فن کار یا تخلیق کار اساطیر سے گریز نہیں کر سکتا اس لیے اساطیر کو خاموش مگر متحرک روایت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔جو کہ ہمیشہ جانبِ منزل رواں دواں رہتا ہے۔

آرٹ انسانی جذبات و خیالات کو تخلیق کی صورت میں دوسروں تک پہنچانے کا بہترین ذریعہ ہے۔فنونِ لطیفہ بھی جذبات کے اظہار اور دل کو چھو لینے والی تخلیق کا نام ہے۔اسی لیے آج رقص، تصویر کشی، شاعری، موسیقی اور مصوری کو فنونِ لطیفہ کا حصہ کہا جاتا ہے اور جمالیات کی بات آئے تو فنونِ لطیفہ اور آرٹ کی اہمیت سے کسی طور انکار ممکن نہیں بلکہ اکثر مفکرین نے تو انہیں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔کیونکہ انسان کے ذوقِ لطیف اور حسِ جمال کے اظہار کا بہترین ذریعہ فنونِ لطیفہ ہیں۔

عمومی طور پر فنونِ لطیفہ کو چار اقسام میں بیان کیا جاتا ہے۔پہلی زبان و ادب یعنی کام، ناول، شاعری اور افسانہ جبکہ دوسری قسم میں فلم، ڈرامہ، رقص، تھیٹر اور موسیقی وغیرہ شامل ہیں۔ تیسری قسم مجسمہ سازی، مصوری اور مینگ تراشی پر مشتمل ہے۔اور چوتھی قسم میں دستکاری، عمارتی فنون، ٹیکسٹائل، خطاطی وغیرہ کو شامل کیا جاتا ہے۔

الغرض آرٹ یا فنون لطیفہ سے مراد اور دلکش، حسین و جمیل یا بامعنی تخلیقات ہیں جو کوئی شخص اپنے تخیل، فن اور ہنر کے استعمال سے وجود میں لاتا ہے۔آج کے معاشرے میں فنونِ لطیفہ کو اظہارِ ذات کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت میں فنونِ لطیفہ جمالیاتی، فنی اور تہذیبی ارتقاء کا اہم وسیلہ ہیں۔ مشہور مفکر سارتر کے بقول آرٹ کا مقصد فرحت و انبساط، لطف اندوزی اور تفریح طبع کا حصول ہے جیسے موسیقی انسان کے دل کو

لبھاتی ہے، انسان جب کوئی دلکش تصویر یا مجسمہ دیکھتا ہے تو سرشار ہو جاتا ہے تو کبھی شاعری اس کے کانوں میں رس گھولتی ہے۔ یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اور ان کیفیات کے پیچھے کونسے محرکات کارِ فرماں ہیں؟ تو اس کا جواب کچھ یوں ہے کہ آرٹ یا فنونِ لطیفہ میں ایک غیر مرئی کشش موجود ہوتی ہے -اور اس کشش کا نام حسن کاری ہے-اور ادبی اصطلاح میں اسے "جمالیات" کا نام دیا جاتا ہے- حصولِ انبساط اور حسن کا اظہار ہی فنون لطیفہ کا بنیادی مقصد ہے۔ فنونِ لطیفہ میں موجود حسن کے تمام عناصر کو پرکھنے کے لیے جمالیاتی تنقید کا سہارا لیا جاتا ہے لہذا جمالیات اور فنونِ لطیفہ کو ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کہا جائے تو یہ غلط نہ ہو گا-

ادب اور فنونِ لطیفہ کا باہمی ربط در حقیقت ان کی مشترکہ جمالیاتی اقدار کی بدولت ہے- کیونکہ فنونِ لطیفہ میں حسن اور حسن کاری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے-جبکہ فنونِ لطیفہ کو اس کی صفت "لطافت" کی وجہ سے ہی فنونِ لطیفہ کہا جاتا ہے۔ فنونِ لطیفہ کی لطافت ہی ہماری جمالیاتی حس کے لیے باعثِ مسرت بنتی ہے کیونکہ فنونِ لطیفہ خواہ کسی بھی مقصد کے لیے تخلیق کیے گئے ہوں جمالیاتی عناصر کے بغیر ان کی تکمیل ممکن نہیں۔ ہربرٹ (Herbert) کے مطابق:

> "آرٹ کے اندر حسن صرف خطوں اور رنگوں کے باہمی تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ افادیت اور حسن کو الگ الگ نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی الگ کیا جا سکتا ہے-"[۲۴]

عمومی طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ تہذیب و تمدن اور توازن و تناسب صرف مہذب اور ترقی یافتہ تہذیبوں کا حصہ ہوتا ہے-جبکہ تعلیم یافتہ ترقی پذیر اقوام و معاشرہ فنونِ لطیفہ اور اس کے لوازمات سے عاری ہوتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ درحقیقت توازن و تناسب اور آہنگ کے عکس کس حد تک انسان کو اپنے جسم میں بھی مل جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر سائنس کے آنے کا آہنگ فقروں میں وقفے کا باعث بنا-اس سے شاعری کی ابتداء ہوئی اور مصرعے کے تصور نے جنم لیا اور یہ ہی اصول سازو آواز کا امتزاج سامنے لانے میں معاون ثابت ہوا -فن پارے میں حسن کاری کا عمل پیچیدہ اور تاریک ہوتا ہے-اس کی نازکی کا خیال رکھنے کے لیے تکنیک کا سہارا لینا پڑتا ہے-تکنیک کا بنیادی مقصد کسی فن کے اظہار کے لیے ایک مخصوص بنیاد یا سانچہ فراہم کرنا ہے-کیونکہ تکنیک کی بدولت ہی آہنگ اور تناسب پیدا کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے فن پارے کی جمالیاتی خوبیوں اور اصل حسن کا کسی

حد تک تکنیک پر انحصار ہوتا ہے۔ فنکار کے احساسات اور تصورات جب اظہار پر آتے ہیں تو وہ بپھرے دریا کی طرح ہوتے ہیں اس صورتِ حال میں تکنیک ہی دھارے کا رخ برقرار رکھنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔

آج کے دور میں فنون کے تکنیکی لوازم نہایت ہی پیچیدہ صورتِ میں دیکھنے کو ملتے ہیں یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور کے ناظر اور تخلیق کار دونوں اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ صرف تہذیب یافتہ تخلیق کار ہی تخلیق کردہ سانچوں کی خصوصیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کے لوازم سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن غیر مہذب تخلیق کار بھی اپنی تخلیق کے لیے حسبِ ضرورت تمام لوازم اور تکنیک کا سہارا لیتا ہے اور ان تکنیک کے قواعد و ضوابط پر عمل کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔

د۔ مضمون نگاری، تعارف اور اقسام:

مضمون عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں "ضمن میں لیے ہوئے" انگریزی میں اس کا مترادف "ایسے (Essay) لاطینی لفظ Exagium سے لیا گیا ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی مسئلے کو عام الفاظ میں پیش کرنا۔ لفظ "ایسے" فرانسیسی زبان کی دین ہے۔ اس صنفِ ادب کی ایجاد کا سہرا فرانسیسی ادیب "مانتین" کے سر جاتا ہے۔

ظہیر الدین اپنی تالیف "اردو ایسیز" میں لکھتے ہیں:

"لفظ ایسز فرانسیسی لفظ اسائی (Essai) کی انگریزی شکل ہے۔ اور اسائی، عربی لفظ "الا ساعی" کی فرانسیسی شکل معلوم ہوتی ہے۔ دونوں الفاظ کوشش کے مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں۔ مانا جاتا ہے کہ لفظ اسائی، یونانی زبان سے فرانسیسی زبان میں آیا ہے۔ مگر گمان غالب ہے کہ عربی لفظ السائی ہی اس کی اصل ہے۔۔۔ آج کل اس صنف کو "ایسے" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ "ایسے" بھی ایک تخلیق ہے۔"[۲۵]

اردو ایسز کے ضمن میں بشیر سیفی لکھتے ہیں:

"ایسے ایک خاص نہج و اسلوب کے مقالے کو کہتے ہیں۔ یہ ایک خاص قسم کی (Soliloquy) ہے زیادہ تر (Objective) قسم جسے ہم (Self-communication) بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک خاص قسم کے فکر و تصور کا نتیجہ ہے جس

میں تجزیہ جذبات ، نفسیاتی مطالعہ ، منطقی استدلال، فلسفیانہ تفکر ، متصوفانہ استقرا اور انشاء عالیہ کا جمالیاتی اسلوب سب کچھ پایا جاتا ہے"[۲۶]

مضامین مختلف قسم کے ہوتے ہیں-مذہبی، افسانوی، سیاسی، تاریخی، معاشی، اخلاقی مگر ان تمام اقسام کو درج ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے-

۱: بیانیہ ۲: تاریخی ۳: تخیلی یا استدلالی

بیانیہ:

اس قسم کے مضامین میں دیہات و شہر کے حالات و واقعات ، میلے، تہوار، حیوانات و نباتات ، تفریحی مقامات کے حسن اور قدرتی مناظر کو بیان کیا جاتا ہے-بیانی مضامین میں واقعات کی وجوہات ،حقائق اور نتائج کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے-مثال کے طور پر تہوار یا میلوں کے مناظر، منانے کی وجوہات ، تاریخ، جگہ ،لوگوں کی دلچسپی، اور ان کے پسِ پردہ حقائق اسی طرح کھیل تماشے، غرض وغایت، تماشائی، نتائج، رائے عامہ، کھیل کے طریقے وغیرہ۔

مصنوعات میں شیئ کی انفرادیت، بنانے کے طریقے، شکل وصورت، موجد کے حالات، استعمال، فوائد ونقصانات وغیرہ- مناظرِ قدرت میں جگہ کا حدود اربعہ ، ارد گرد کے حالات، مناظر اور علاقے پر اثرات، فوائد ونقصانات، موسم، عروج کا موسم، انسان، حیوانات و نباتات پر اثرات اور فوائد ونقصانات وغیرہ، نباتات، تعارف، اقسام بناوٹ، استعمال کے طریقے، فوائد ونقصانات وغیرہ-

تاریخی مضامین:

تاریخی مضامین میں سوانح حیات، تاریخی عمارتیں۔ تاریخی حادثات، انقلاب اور نظامِ مملکت وغیرہ شامل ہیں۔

تاریخی مضامین میں تاریخی واقعات ، تاریخی شخصیات کی سوانح حیات ، مذہبی شخصیات کے حالاتِ زندگی، ذرائع معاش، عادات وخصائل، کمال، فن، اوصاف وغیرہ شامل ہیں۔

اہلِ قلم کے حالات:

آباواجداد، تاریخ پیدائش، مقامِ پیدائش، بچپن، ماحول، عادات وخصائل، شکل وصورت، معاش کے ذرائع، زمانے کے حالات، اندازِ بیان، کلام کے اثرات، عوام کی کیفیات، تجارتی حالات، وفات، مدفن، یادگاریں، وغیرہ

بادشاہوں کے حالات:

ابتدائی حالات، خاندان، تخت نشینی، عادات واخلاق، طرزِ حکومت، دورِ حکومت کے حالات و واقعات، جنگ وجدل، مشہور اشخاص، پبلک کی کیفیت، وفات، مدفن-اس کے علاوہ موجدوں کے حالات، تاریخی عمارات، خاص خاص مقامات وغیرہ، پر مضامین اس ضمن میں تحریر کئے جاتے ہیں

تخیلی مضامین:

تخیلی یا استدلالی مضامین میں اخلاقیات، مباحثے مناظرے، موازنہ، مقابلہ وغیرہ شامل ہیں اس میں فکری استدلال اور منطقی دلائل سے کام لیا جاتا ہے-مناظرے اور مباحث میں طرفین کی تعریفیں، دونوں اطراف کے دلائل، نتائج اور دیگر امور وغیرہ کا ذکر کیا جاتا ہے-اخلاقیات میں تعریف، دلائل، امثال اور نتائج -اسی طرح معاشیات، سماجیات، ادبیات میں تعارف، اصول وضوابط، فوائد ونقصانات وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

ا۔اردو مضمون نگاری کی روایت:

۱۸۵۷ کے حالات وواقعات نے مسلمان رہنماؤں کو جھنجھوڑ کر رکھ ڈالا یہ واقعات مسلمانوں اور ان کے اہم رہنماؤں بالخصوص سر سید احمد خان میں انقلابی تبدیلی کا باعث بنے۔ سر سید احمد خان نے ان حالات وواقعات کا نہایت باریک بینی اور عمدہ طریقے سے جائزہ لیا—اور یہ حل نکالا کہ حکومت سے تصادم مسلمانوں کے کسی مسئلے کا حل نہیں لہذا انہوں نے حکومت سے اختلاف کے بجائے اپنی ساری طاقت مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے لیے

ہونے والے تعمیری کاموں میں صرف کی-اس مقصد کے لیے انہوں نے مختلف تحریکیں چلائیں، سکول قائم کیے ،اخبارات ورسائل جاری کیے اور انجمن بنائیں۔ آپ نے اپنے رسالے "تہذیب الاخلاق" کے وسیلے سے اردو زبان کی صفائی اور سادگی کو پروان چڑھانے کے لیے کوششیں کیں-اور اس بات پر زور دیا کہ اردو نثر کو متوازن، سنجیدہ، علمی اور معیاری بنایا جائے۔ علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر سرسید اور ان کے ساتھ دوسرے عظیم رہنما جن میں نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، چراغ علی حسرت اور مولانا الطاف حسین حالی نے اردو نثر کے فروغ کے لیے کوششیں کیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے مختلف قسم کے مضامین تحریر کیے اور اپنی مختصر مگر جامع تحریروں کے ذریعے اپنے خیالات کو عام عوام تک پہنچایا جس کے ذریعے سے مسلمانوں میں سیاسی اور سماجی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان کے فروغ میں مضمون نویسی نے اہم کردار ادا کیا اور اردو میں مضمون کو بطور صنف متعارف کروانے میں انہی عظیم رہنماؤں کا ہاتھ ہے۔اس ضمن میں مولانا شبلی نعمانی اور ماسٹر رام چندر کا نام بھی قابلِ ذکر ہے- جنہوں نے اپنی تحریروں سے مضمون نویسی کے فن کو آگے بڑھایا۔

اردو میں مضمون نگاری کو باقاعدہ طور پر سرسید احمد خان نے متعارف کروایا انہوں نے انگریزی زبان کے مشہور مضمون نگاروں کے مضامین کو پڑھا اور ان کے طرزِ تحریر کی تقلید کی بھرپور کوشش کی۔اس ضمن میں انہوں نے اپنے رسالے کے ذریعے مضمون نویسی کی صنف کو آگے بڑھایا-بنیادی طور پر سرسید احمد خان نے تین طرح کے مضامین کو اپنے قلم کا حصہ بنایا جن میں دینی مضامین، خالص مذہبی اور سیاسی مضامین شامل تھے-اس کے علاوہ انہوں نے معاشرتی اصلاح اور عام افراد کی فلاح و بہبود کے حوالے سے بھی مضامین تحریر کیے-انہاں نے اپنی مضامین نویسی کے ذریعے معاشرے میں موجود کاہلی، جہالت، خوشامد، خودغرضی، منافقت اور تعصب جیسی برائیوں کے خلاف آواز اٹھائی۔انہوں نے مضامین میں عورت کے حقوق، قومی یکجہتی، باہمی اتحاد واتفاق اور اصلاحِ اخلاق و معاشرت کے فروغ کے لیے کوشش کی۔ ان کے مضامین میں جہاں ایک طرف بے شمار خوبیاں تھیں وہاں بعض کمزوریاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ جن میں علمی و اصلاحی معلومات بڑے پیمانے پر دیکھنے کو ملتی ہیں جن کے سبب مضمون کا مزا پھیکا پڑ جاتا ہے تو دوسری طرف ان کے مضامین میں سنجیدگی کا عنصر پایا جاتا ہے اور زیادہ تر مضامین میں وہ بحثیتِ معلمِ اخلاق نظر آتے ہیں۔ ان کے مضامین میں طنز و مزاح اور ہلکی پھلکی تحریروں کا

فقدان نظر آتا ہے۔ ان کمزوریوں کے باوجود سر سید احمد خان کو اردو کا پہلا مضمون نگار تصور کیا جاتا ہے اور سر سید احمد خان کی تحریک کو اردو کی پہلی تحریک تصور کیا جاتا ہے جس کے ذریعے سے ذہنی انقلاب برپا ہوا۔ یہی تحریک تھی جس نے اردو ادب میں نثر نگاری کو متعارف کروایا اور وہ ادب جو پہلے صرف شاعری تک محدود تھا اس میں نثری انقلاب برپا ہوا- اس تحریک کی وجہ سے مضمون نگاری کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگاری، تاریخ نگاری، ناول نگاری، افسانہ نگاری اور تنقید غرض اردو ادب کی ہر صنف پروان چڑھنے لگی- سر سید احمد خان سے قبل خطوطِ غالب، فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کے ذریعے سے اردو نثر منظر عام پر آچکی تھی۔ سر سید احمد خان کے علاوہ ان کے رسالے تہذیب الاخلاق میں اور بھی اہم لوگوں نے مضامین تحریر کیے۔ جن میں ایک نام چراغ علی کا ہے- جنہوں نے مضمون نویسی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ان کے مضامین میں مذہبی مضامین کو شہرت ملی کیونکہ اس وقت برصغیر پاک و ہند میں عیسائی مشنری پورے زوروشور کے ساتھ کام کر رہی تھی- جو کہ عیسائیت کو پروان چڑھانے میں پیش پیش تھی۔ چراغ علی نے ایسے مضامین تحریر کیے جو کہ اسلام دوستی کا منہ بولتا ثبوت تھے انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعے ان اعتراضات کو ختم کرنے کی کوشش کی جو کہ اسلامی عقائد کے خلاف تھے- انہوں نے اپنے مضامین میں یہ ثابت کیا کہ اسلام قومی ترقی کا دشمن نہیں ہے بلکہ اسلام امن اور محبت کا درس دیتا ہے-اس کے علاوہ محسن الملک نے بھی اپنے مضامین کے ذریعے مسلمانوں میں شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔

شبلی نعمانی مؤرخ، شاعر، عالم، مفکر غرض یہ کہ بے شمار خوبیوں کے مالک تھے-ان کا نام اردو کے عناصرِ خمسہ میں آتا ہے- انہوں نے اردو نثر کے لیے اہم خدمات سر انجام دیں وہ اپنی اعتدال پسندی اور فہم و فراست کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کے مضامین "مقالاتِ شبلی" کے نام سے شائع ہوئے ہیں جو کہ آٹھ جلدوں پر مشتمل ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعے اسلام، تاریخ، سیاست اور تنقید میں نمایاں اضافے کیے۔

مولوی ذکاء اللہ کا شمار بھی اردو کے اہم مضمون نگاروں میں ہوتا ہے وہ دینی خدمات کے حوالے سے مشہور ہوئے ان کی علمی و ادبی خدمات پر انہیں " خان بہادر اور شمس العلماء "جیسے خطبات دیے۔ انہوں نے مختلف اور منفرد موضوعات پر کتابیں لکھیں اور ایسے موضوعات کو قلم کا حصہ بنایا جس پر پہلے کسی نے کوئی تحریر نہ لکھی تھی۔ آپ نے مختلف رسائل و جرائد اور اخبارات میں بہت سے مضامین تحریر کیے – "مخزن" لاہور اور

تہذیب الاخلاق جیسے نامور رسائل میں مستقل لکھاری کی حیثیت سے مضامین تحریر کیے ان کے مضامین میں غور و فکر اور تحقیق و تنقید کے نمایاں اوصاف نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عابد علی عابد، ڈاکٹر، اسلوب، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۱، ص: ۱۰

۲۔ سلطان احمد، مرزا، فنونِ لطیفہ، مکتبہ جمال، لاہور، ۲۰۰۹، ص: ۱۰

۳۔ سلطان احمد، مرزا، فنونِ لطیفہ، مکتبہ جمال، لاہور، ۲۰۰۹، ص: ۱۱

۴۔ زاہد ہمایوں، مراثی انیس کے جمالیاتی عناصر، پورب اکادمی، ۲۰۱۶، اسلام آباد،: ص: ۲۳

۵۔ القرآن: سورہ السجدہ: ۲۳:۷

۶۔ القرآن، سورہ الفرقان ۲:۲۵

۷۔ ابو الاعجاز، حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵، ص: ۱۷۱

۸۔ صاحبزادہ حمید اللہ، فن اور تکنیک، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰، ص ۵۲

۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۷، ص: ۲۲

۱۰۔ مجنوں گورکھ پوری، تاریخ جمالیات، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷، اشاعتِ دوم، ص: ۱۲

۱۱۔ مجنوں گورکھ پوری، تاریخِ جمالیات، فکشن ہاؤس، لاہور اشاعتِ دوم، ۲۰۱۷، ص: ۱۳۔۱۴

۱۲۔ عبارت بریلوی، ڈاکٹر، اردو تنقید کا ارتقاء، کراچی، انجمنِ ترقی اردو پاکستان، ۱۹۴۱، ص: ۲۴

۱۳۔ خاطر غزنوی، جدید اردو ادب، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۸۵، ص: ۸۴

۱۴۔ عبارت بریلوی، ڈاکٹر، اردو تنقید کا ارتقاء، کراچی، انجمنِ ترقی اردو پاکستان، ۱۹۴۱، ص: ۵۶

۱۵۔ نوازش علی، ڈاکٹر، فراق گورکھ پوری، شخصیت اور فن، لاہور، دستاویز مطبوعات، ۱۹۹۳ص: ۱۵۴۴

۱۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، اسلام آباد، نیشنل بک فاونڈیشن، ۱۹۹۳، ص: ۴۹

۱۷۔ نعیم نقوی، پروفیسر، ڈاکٹر، تنقید و تناظر، کراچی، ماڈرن کالونی، ۱۹۹۶، ص: ۱۱۷

۱۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، مکتبہ عالیہ اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۷، ص: ۴۳

۱۹۔ نوید اسلم، شیخ، پاکستان کے آثارِ قدیمہ، بک ہوم، لاہور، ۲۰۱۲، ص: ۴۱۴

۲۰۔ صہبا وحید، ہندی / اسلامی فنِ تعمیر، اردو اکادمی، لاہور، نئی دہلی، ۱۹۹۵، ص: ۵۰

۲۱۔ قاضی قیصر السلام، فلسفے کے بنیادی، مسائل، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، اگست ۲۰۱۵، اشاعت دوم، ص:۹۴،۹۳

۲۲۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اشاراتِ تنقید، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۴، ص:۵۶

۲۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید، سنگِ میل پبلیکشنزِ لاہور، ۲۰۱۱، ص:۴۵۶

۲۴۔ صاحبزادہ حمید اللہ، فن اور تکنیک، سنگِ میل پبلیکشنز، لاہور، ۱۹۹۰، ص:۵۱

۲۵۔ ظہیر الدین مدنی، سید، اردو ایسز، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بمبئی، ۱۹۵۸، ص:۷

۲۶۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، نذیر سنز پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰، ص:۱۵

باب دوم

"سہ ماہی سیپ" کا فنونِ لطیفہ کے فروغ میں کردار

ادبی رسائل و جرائد تہذیب و آگہی کے سرچشمے عقل و فکر کے خزائن اور ماضی، حال اور مستقبل کے ترجمان ہوتے ہیں۔ جہالت سے علم، شعور اور تہذیب و تمدن کی راہ دکھانا ادبی رسائل و جرائد کا خاصہ رہا ہے۔

وساوس کی کہر آلود وادیوں کے پر خار راستوں کے مسافروں کو امید و یقین کی شاہرہ پر گامزن کرنا ادبی رسائل کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے- ادب کو زندگی کی بامعنی سرگرمی قرار دیا گیا ہے اور ادبی رسائل کی مدد سے اس سرگرمی میں مزید نکھار پیدا کیا جا سکتا ہے- ادبی جرائد نسلی تفاخر اور طبقاتی کشمکش کے خاتمے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

ادبی رسائل و جرائد میں ہر عمر، طبقہ، مسلک اور سوچ کے افراد کی تحریریں موجود ہوتی ہیں ان ادباء، شعراء اور علماء سے ایک ایسا حلقہ ترتیب پاتا ہے جو کسی قوم کی تہذیبی فکر اور ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ قیامِ پاکستان اور اس کے بعد کے دور میں ادبی رسائل نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تخلیقی اصناف، ادب کے مباحث و مسائل، تنقید و تحقیق ادبی رسائل کی اہمیت و افادیت میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ تقسیم کے بعد ۱۹۴۸ سے ۱۹۹۹ تک پاکستان میں شایع ہونے والے رسائل و جرائد کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔ سب کا اندراج ممکن نہیں، البتہ چند اہم نوعیت کے جریدے، جنہوں نے ادبی سرگرمیوں کے فروغ میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا، ان میں چٹان، نقوش، قومی زبان، سنگ میل، اردو ادب، ماہِ نو، نئی قدریں، انشاء، مہر نیم روز، قند، لیل و نہار، صحیفہ، داستاں، شعور، نصرت، سات رنگ، قلم کار، اسلوب، فنون، سیپ، اوراق، تخلیق، الفاظ، پاکستانی ادب، غالب، احساس، معاصر، ادبیات، حروف، قرطاس، تلاش، آج، بادبان، مکالمہ، چہار سو، نقاط، اردو نامہ، الحمرا، الاقربا، دنیائے ادب، ارتقا اور دیگر شامل ہیں۔ بیسویں صدی سے پاکستان میں ادبی جرائد کے تناظر میں ایک نیا عہد شروع ہوتا ہے جن ادبی رسالوں کی اشاعت ۲۰۰۰ سے پہلے ہوئی، ان میں سے کئی تو ایسے ہیں جن کی اشاعتی عمر کا عرصہ کئی دہائیوں پر مشتمل ہے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے جن رسائل کی اشاعت جاری تھی اور بعد میں بھی وہ چھپتے رہے، ان میں اردو، ہمایوں، نگار، عالم گیر، نیرنگِ خیال، ساقی، ادبِ لطیف، شاہ کار، کتاب، نظام، افکار، سویرا، نیا دور اور عصمت جیسے رسائل شامل ہیں۔ ان کے علاوہ

مختلف ادوار میں جن رسالوں نے ادبی خدمات کی ابتدا کی اور وہ اب تک کام یابی سے اشاعت پذیر ہی نہیں بلکہ مقبول بھی ہیں، ان میں فنون، قومی زبان، سیپ، ادبیات، قرطاس، آج، چہار سو اور دنیائے ادب شامل ہیں۔

۲۰۰۰ سے ۲۰۱۴ تک متعدد نئے ادبی رسالے شائع ہوئے اور کئی اشاعت کے کچھ عرصے بعد چھپنا بند ہو گئے۔ اس عرصے میں پاکستان کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والے چند نمایاں رسائل و جرائد میں کراچی سے دنیازاد، روشنائی، جوش شناسی، زر نگار، اجرا، اسالیب، اجمال، رنگِ ادب، لاہور سے نمودِ حرف، لوح، گجرات سے تناظر، فیصل آباد سے نقاط، پشاور سے احساس، کوئٹہ سے سنگت، قلم قبیلہ وہ ادبی رسالے ہیں، جو باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے ہیں اور انہیں ادبی دنیا میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ ادبی رسائل و جرائد کے رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سوائے چند اخبارات کے سب نے ادبی صفحات کو فراموش کر دیا۔ اس تمام صورت حال کے باوجود ادبی رسائل و جرائد کا شائع ہونا غنیمت ہے۔

> " ادبی جرائد کے ذریعے ادباء، فضلاً اور علماء کا ایک ایسا حلقہ تشکیل پاتا ہے جو اقوام کی ثقافتی، تہذیبی اور فکری تعمیر و ترقی میں بھرپور کردار ادا کرتا ہے۔ انہی ادباء، عملاء اور فضلاء کی علمی سوچ، فلسفہ، سائنس، مذہب اور دیگر علوم میں کارفرما ہوتی ہے۔ جہالت اور لاعلمی کا زنگ اتار کر عوام اور خواص کے اذہان و قلوب کو منور کرتی ہے۔ نیز دروغ و مصلحت کے صحرائے اعظم میں ادبی جرائد اعتماد کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ آج کے دور میں ادبی جرائد اردو زبان و ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ تخلیقی اوصاف، تحقیق و تنقید ادب کے مسائل اور مباحث ادبی جرائد کی اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ "[1]

اردو زبان و ادب کو نئی فکر عطا کرنے کے میں رسائل کا اجراء بہت اہم ہے۔ سیپ کے اجراء کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا اس میں نئے موضوعات، فکر، سوچ اور انداز موجود ہے جس کی بنیاد پر اسے نئے دور اور فکر کا ترجمان کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اس جریدے کی انفرادیت یہ تھی کی اس میں ہر عمر کے افراد کو ادب سے متعلق ہر موضوع پر تحریر کرنے کا اختیار موجود تھا۔ خاص طور پر نوجوان لکھاریوں کی ایک بڑی تعداد اس پلیٹ فارم کے ذریعے سے اپنی سوچ کو آگے پہنچاتی ہے۔ اس کی تحریروں میں زندگی کے اصلاحی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے -اس میں ایسی تخلیقات کی اشاعت ناممکنات میں سے ہے جو کہ حوصلہ شکنی، قنوطیت اور مایوسی پر مشتمل ہوں۔ سہ ماہی سیپ کا پہلا شمارہ نومبر ۱۹۶۳ میں شائع ہوا۔ جس میں پرانے اور نئے ادب کے لکھاریوں کے

نام شامل تھے۔ نسیم درانی جو سیپ کے مدیرِ اعلیٰ ہیں نے نئے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں اپنی تخلیقات کو دنیا کے سامنے لانے کا موقع فراہم کیا۔ گویا سیپ نے نئی سوچ کے حامل شعراء، ادیبوں اور دانشوروں کو ایک ایسا سائبان عطا کیا جس کے سائے تلے انھوں نے اپنی تخلیقات کو عام عوام تک پہنچا کر برصغیر کے پاک وہند میں ایک اہم اور باعزت مقام حاصل کیا۔ سہ ماہی سیپ کے پہلے شمارے میں جہاں حمید کاشمیری، شوکت صدیقی اور عصمت چغتائی کے نام شامل ہیں وہیں اس میں ادب کے نئے لکھنے والے عطیہ پروین، امِ عمارہ، عبید اللہ علیم بھی اپنی فکر و دانش کے موتی بکھیرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سیپ کو آغاز سے ہی مقبولیت و دوام نصیب ہوا۔ علم دوستوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کی مقبولیت اور مانگ میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ہر دور ہر دہائی میں اس کی مقبولیت میں اضافے کی وجہ اس میں نئے اور منفرد لکھاریوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کے بڑے ناموں کی تخلیقات کی شمولیت بھی تھی- آج کے پرانے اور اس دور کے نئے شاعروں، ادیبوں اور تخلیق کاروں کو سہ ماہی سیپ میں جگہ دی گئی۔ سہ ماہی سیپ نے اردو مضمون نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں بھی اہم کردار ادا کیا- سہ ماہی سیپ کے آغاز کے وقت کا دور اور اردو مضمون نگاری کے ارتقاء کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے۔ اس رسالے نے اردو مضمون نگاری کو اس وقت پھلنے پھولنے کے لیے جگہ دی جب وہ ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی۔

اس میں ہر موضوع پر ادبی اور غیر ادبی مضامین شائع کیے جاتے تھے اور یہ مضامین عوام میں نئی فکر و سوچ کی بیداری کا اہم ذریعہ تھے- صنفِ شاعری میں منظور حسین شور، سحر انصاری، رسا چغتائی، عبد العزیز خالد، بلراج کومل، انجم اعظمی، باقر مہدی الغرض کثیر تعداد میں نئے اور پرانے تخلیق کاروں کی تخلیقات کو سیپ کی زینت بنایا گیا- اردو نثر میں اقبال ظفر، مظہر الاسلام، سمیع آہوجا، انجم اعظمی اور اس فہرست میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ نام جو سیپ کے افق پر طلوع ہوئے سیپ نے بطورِ غیر جانبدارانہ رسالہ اپنی پالیسی کو آگے بڑھایا اور کوئی بھی ایسا مواد یا تحریر اپنے کسی رسالے میں شائع نہ کیا جو تعصب اور اختلاف کا سبب بنے۔ گویا یہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیپ کو ہر مکتبہ فکر کے لوگوں کی تخلیقات سے مزین کیا گیا۔ سیپ کی پالیسی کے مطابق کسی بھی گروہ، طبقہ یا مسلک کا بندہ اگر اس کی تحریر میں جان ہے اور وہ ادبی معیار پر پوری اترتی ہے تو اسے رسالے کی زینت بنایا جائے گا۔

سہ ماہی سیپ کے لکھاریوں کے خیال میں ادب کی ساکھ کے لیے سب سے بڑا خطرہ ادبی فرقہ واریت(Literary sectarianism) ہے- لہذا انہوں نے ہر ممکنہ حد تک سیپ کو اس فرقہ واریت سے دور رکھنے کی کوشش کی "سیپ" کو اگر زندگی کی دائمی اقدار کا محافظ کہا جائے تو یہ غلط نہ ہو گا- سیپ کے اداریوں میں بھی زندگی اور ادب کے تعلق کو تسلیم کیا گیا اور اس میں ایسے مضامین کو جگہ دی جاتی رہی جن میں زندگی اور ادب کو لازم و ملزوم سمجھا جاتا تھا۔ ادب کے بغیر زندگی کا مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایک تخلیق کار ادب ہی کی وجہ سے ہی زندگی کی راہیں متعین کرتا ہے اور معاشرے کا وجود ادیب اور ادب کے بغیر مردہ اور بے معانی ہوتا ہے۔

ادیب معاشرے کا ذمہ دار اور حساس فرد ہوتا ہے وہ اپنی تحریروں کے ذریعے سے معاشرے کی تصویر کشی کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اپنی تخلیقات کے ذریعے سے معاشرے میں پائی جانے والی برائیوں اور ناپاکیوں کو دور کیا جائے اور اصلاحی تحریروں کے ذریعے معاشرے میں اچھائیوں کو فروغ دے۔

سہ ماہی سیپ کی غیر جانبدارانہ پالیسی کے بارے میں ایکسپریس کو انٹرویو دیتے ہوئے نسیم درانی سے سوال کیا گیا:

> "آپ کا رجحان ترقی پسند ادب کی طرف ہے لیکن "سیپ" میں تو ہمیں ہر طرح کے رجحان کے حامل تحریریں نظر آتی ہیں"

تو نسیم درانی نے جواب دیا:

> "ذاتی رجحان ایک الگ بات ہے ترقی پسندی کا نعرہ ہے آزادی / اظہار، اگرچہ کوئی تحریر ترقی پسند نہیں ہے لیکن ان کی تحریر میں جان ہے میں اسے نہ چھاپوں تو اس کا مطلب ہے میں اپنے منشور سے رو گردانی کر رہا ہوں بات یہ ہے کہ نئے لکھنے والے میں اگر ذرا سے بھی امکانات ہیں تو اس کی کمزور تحریر بھی چھاپنا پڑتی ہے-"[۲]

گویا" سہ ماہی سیپ" کو ہر مکتبہ فکر کی تحریروں سے مزین کیا جاتا ہے۔ سیپ کے اداریوں میں بھی ایسی تحریروں کو شامل کیا جاتا ہے جو حقائق زندگی پر مشتمل ہوں ایسے مضامین کی شمولیت کو زیادہ ضروری سمجھا جاتا ہے جو ادب اور زندگی کے تعلق کی وضاحت کرتے ہوں۔ کیونکہ ادب اور زندگی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ادب زندگی کی راہوں کے تعین میں مدد فراہم کرتا ہے- ادیب اور ادب کے بغیر معاشرہ مردہ ہو جاتا ہے اور اس پر جمود کی سی کیفیت طاری رہتی ہے۔

سہ ماہی سیپ کے شمارہ نمبر ے میں ڈاکٹر میمونہ انصاری کا مضمون " ادب برائے زندگی" میں زندگی کے مسائل و حقائق کے حل کو ادب میں تلاش کیا گیا ہے۔

> "کیا آپ نے کوئی ایسا جملہ سنا یا پڑھا ہے جو زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے متعلق نہ ہو۔ جس زبان میں یہ جملہ یا شعر کہا گیا ہو وہ زبان یقیناً زندگی سے براہ، راست ناطہ جوڑے ہوئے ہو گی۔اس کے الفاظ اپنے اندر کچھ نہ کچھ معانی ضرور رکھتے ہوں گے یہ معنی زندگی کی دلیل ہیں۔"[۳]

فنونِ لطیفہ اور قدرتی عوامل و مظاہر میں سے ذرے ذرے کی شناخت جمالیات کے بغیر ناممکن ہے۔ ماہرینِ جمالیات کے مطابق کسی چیز کا پہلا تخلیق کار خدا ہوتا ہے یعنی کہ جمالیات خدا اور اس کے مظاہر کی پہچان کا نام ہے۔ایک ادیب نہایت عمدہ طریقے سے اپنے خیالات کی ترسیل سے دوسروں میں احساس بیدار کرتا ہے۔جس طرح آواز میں توازن و ترتیب اور اشارے ادب کی تخلیق کا ذریعہ ہیں بلکل اسی طرح آواز کا حسن موسیقی، جسمانی حرکات کا حسن رقص اور رنگوں کا حسن مصوری کو جنم دیتا ہے۔

حسن کی اہمیت کو ذہن میں رکھنے کے لیے اس کی ماہیت پر بھی غور کرنا چاہیے۔ ہر شخص کے نزدیک حسن کا اپنا معیار ہے کسی شخص کو ماضی یا ماضی بعید میں کوئی شے اچھی لگے تو ضروری نہیں مستقبل میں بھی اسے وہ شے اچھی لگے۔ حسن ہمیں لطف و سرور اور خوشی مہیا کرتا ہے۔ حسن عشق و محبت، شفقت، قہر آلودگی، مردانگی ،خوف، قلب اور رحم کے جذبات سے مزین ہوتا ہے لہذا حسن اور حسن کے مظاہر کو دیکھنا اور اس کے مظاہر کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے نیز مظاہرِ فطرت کے بارے میں آگہی اور حسن کی ماہیت کے بارے میں جاننے کے لیے اس کے جمالیاتی مظاہر سے واقفیت بہت ضروری ہے جبکہ جمالیاتی مظاہر کے اظہار کا سب سے اہم ذریعہ فنونِ لطیفہ ہیں۔ ان کے ذریعے سے انسان اپنی سوچ کو باقاعدہ سانچے میں ڈھال کر دوسروں تک پہنچا سکتا ہے۔ماہرینِ جمالیات نے ادب کو حسن کا نمائندہ قرار دیا ہے۔اور ان کے خیال میں ادب خود حسین ہے اور اس کا مقصد حسن کے سوا کچھ نہیں۔ادب حسن کے ادراک کا ذریعہ ہے اور ادراکِ حسن ہی باعث انبساط ہے۔ ادب کا تعلق بھی حسن سے ہے اور فنونِ لطیفہ بھی حسن کے اظہار کا نام ہے۔لہذا ادب اور فنون لطیفہ ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔

ادیب اپنی سوچ و فکر سے ادب تخلیق کرتے ہیں اور فن کار فنونِ لطیفہ کے اظہار کے ذریعے سے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ادب اور فنونِ لطیفہ معاشرے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کو پروان چڑھانے کا اہم ذریعہ ہیں۔۔ مصوری، موسیقی، خطاطی اور سنگ تراشی متذکرہ فنون کی نمایاں اشکال ہیں۔ مصوری بصارتِ انسانی کے جمالیاتی ذوق کا سامان مہیا کرنے کے ساتھ بصیرتِ انسانی کو جلا بخشتی ہے۔ میاں محمد شریف کے مطابق تحریری تخلیق میں لفظ و معنیٰ کا لاشعور سے شعور میں جلوہ افروز ہونا، تخلیق کے حُسن میں افزونی کا سبب ہے، بعینہٖ فنِ مصوری میں تصویر و لکیر کے خاص استعمال میں مضمر معنیٰ و مفہوم کا لاشعور سے شعور تک کا فاصلہ طے کرنا اس کے جمالیاتی پہلو کو اُبھارتا ہے۔ مع ازیں مصور اپنے تصورِ حُسن کو اپنی تخلیق کی صورت میں ڈھالتا ہوئے، کتھارسس کے ساتھ جمالیاتی حِس کی تسکین کا اہتمام کرتا ہے۔ موسیقی سماعتِ سامع کی جمالیات کو حظ پہنچاتی ہے، سُر، تال اور لے کے ارتعاش سے بننے والی مدھر اصوات کا منظم تسلسل سننے والے کو اطمینان اور بعض صورتوں میں ذوقِ عمل مہیا کرتا ہے، اسی طرح موسیقار انگلیوں کی مخصوص و متواتر حرکات سے ایک خاص آہنگ کی آوازیں بکھیرتے ہوئے اپنے حسِ جمال کا اظہار کرتا ہے۔ خاص آہنگ میں مربوط آوازوں کے زیر و بم سے مترشح معانی و مفاہیم کی بازگشت موسیقی کے حُسن و جمال کو بڑھاتے ہوئے شعور و لاشعور میں افکارِ نو کی بنیاد کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ خطاطی خود خطاط اور ناظر و قاری کے ذوقِ حُسن کی ترجمان ہے۔ لفظ اور اندراجِ لفظ کے مخصوص و متفرق انداز خطاط کے ذوقِ جمال کی عکاسی کرتے ہیں، نیز لفظ و معنیٰ کے ظاہری و پس ظاہری تعلق سے فن کار جمالیات کے تین پہلوؤں (ظاہری و حسی حظ، وجدانی حظ، تدارکِ نو کا حظ) پر محیط ایک شاہ کار تخلیق کرتا ہے، مزید برآں ناظر و قاری اپنی استعداد کے مطابق تفہیم کے مراحل سے گزرتے ہوئے فن سے لُطف اندوز ہوتا ہے۔ سنگ تراشی فنِ لطیفہ کا ایک حسین و دقیق مظہر ہے۔ سنگ تراش اپنے ذہن کی پرتوں سے فکر کے پہلو سمیٹتا ہوا، حسِ جمال اور فنِ کمال کے توسط سے خام، نوکیلے اور بدھے پتھروں کو حسین پیکر میں ڈھال کر ناظرین کو حُسن کی نئی تعبیر کا ثبوت دیتا ہے۔ شر سے خیر نکلنے کی عملی تصویر، بدصورتی سے خوب صورتی کے اخراج کی شکل میں مہیا کرتا ہے۔ فنِ سنگ تراشی تخلیق کے ظاہری حُسن اور باطنی معانی کے باہمی ربط سے شعورِ انسانی کو فکر انگیزی کے پہلو فراہم کرتے ہوئے لطیف احساس بھی مہیا کرتا ہے۔ سہ ماہی "سیپ" میں فنونِ لطیفہ کی مذکورہ چاروں اقسام پر مختلف شمارہ جات میں متفرق مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ جمالیات کے متذکرہ تین پہلو؛ یعنی ظاہری حُسن کی

تفہیم اور اس سے لُطف اُٹھانا، ظاہری حُسن اور شعور کے توسط سے وجدانی جمال تک رسائی اور وجدان کی تفہیم سے حظ کشید کرنا اور شعور و وجدان کے ذریعے لاشعور میں پنہاں افکارِ نو کا تدارک اور اس تدارک سے مسرت کشید کرنا؛ ان مضامین کا لازمہ ہیں، ذیل میں مذکورہ پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے فنونِ لطیفہ پر مرقوم مضامین کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے:

الف۔ مصوری:

مصوری کا تعلق بصارت سے ہے۔ مصوری ایک بصری نوعیت کا فنکارانہ اظہار ہے جو کہ ایک خاص سطح پر چند جمالیاتی اقدار کی روشنی میں تکنیک سے تخلیق کی جاتی ہے۔ عموماً مصوری میں پلاسٹک کی نمائندگی کرنے والے عناصر کو شامل کیا جاتا ہے۔

تمام اصطلاح میں اس سے مراد ایسی تکنیک یا نظم وضبط ہے جس میں مخصوص سطح (کپڑا، دھات، کاغذ) پر رنگ دار مادے سے کچھ بنانا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کی وضاحت یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ کسی فنکار کا اپنے جذبات، تخیلات اور احساسات کا تصویری صورت میں اظہار مصوری کہلاتا ہے۔

رنگدار مادہ یا رنگ حاصل کرنے کے لیے بہت سے ذرائع ہیں مثلاً زمین، پودوں یا بعض نباتات سے حاصل کردہ قدرتی رنگ یا پھر انھیں کیمیائی طور پر تیار کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پُرانی رنگین تصاویر جو دیکھنے کو ملتی ہیں وہ تقریباً پندرہ ہزار سال پُرانی ہیں۔ اس میں پہلی بار رنگوں کی مدد سے تصاویر بنائی گئی ہیں۔ یہ تصاویر ہسپانیہ کے غاروں آلتامیر (Altamira) اور فرانس کے جنوب میں لاس کیئو (Lascaux) کے مقام پر دریافت ہوئیں ۔ اس وقت ان تصاویر میں جو رنگ استعمال کیے گئے وہ جلی ہوئی لکڑی، ہڈی کے برادے اور زمینی رنگدار مادوں سے حاصل کردہ تھے۔

ارتقائے انسان کے پہچانے کو اگر وسیع کر کے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وقت کہ ہر کروٹ میں مصوری کی علامت موجود ہے۔ یعنی اگر اس کو انسان کی بنیادی حس کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ دراصل مصوری کے جتنے بھی ادارے ہیں اس کے بارے میں عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ وہ معاشرے سے الگ تھلگ ایک الگ سی دنیا ہیں۔ دراصل تخلیقی عمل ایک خاص ماحول کا متقاضی ہوتا ہے۔ جسے فراہم کرنا اس ادارے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ایک ادارے کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے طلباء کو معاشرتی پہچان کے باوجود ان کے

اندر کے فن کو باہر نکالے۔ اور ان کے فن کا عکاس بنتے ہوئے ان کے ذاتی تشخص کو ابھارے۔ ادبی رسائل بھی کیونکہ ہر عمر کے افراد میں یکساں مقبول ہوتے ہیں اور یہ لوگوں میں ادبی اور غیر ادبی سرگرمیوں کے پھیلاؤ کا اہم ذریعہ بنتے ہیں۔ ادبی رسائل میں فنونِ لطیفہ کے مضامین کی اشاعت سے لوگوں کو ان فنون سے متعلق آگاہی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ مضامین ان میں چھپی صلاحیتوں کو سامنے لانے کے سلسلے میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں " سہ ماہی سیپ " میں بھی فنونِ لطیفہ کا علیحدہ گوشہ مختص کرنے کا مقصد یہی ہے کہ اس کے ذریعے سے لوگوں کو ان فنون سے متعلق آگاہی حاصل ہو۔ وہ عملی زندگی میں ان فنون کی اہمیت سے واقفیت حاصل کر سکیں۔ اور اپنے اندر کی فنکارانہ صلاحیتوں کو نکھار کر لوگوں کی اصلاح کا ذریعہ بن سکیں۔

سہ ماہی سیپ میں شائع ہونے والے منتخب مضامین یہ ہیں: "مغل فنِ مصوری" از محبوب اللہ (شمارہ ۲، ۱۹۶۴ء)، "تخلیق اور تخلیق کار" از حفیظ انیس (شمارہ ۔۔۔، ۲۰۱۵ء)، "مذہب اور مصوری" از اعجاز حسن (شمارہ ۳، ۱۹۶۵ء)، "فنِ مصوری اور مصور" از شیخ ممتاز حسین (شمارہ ۶، ۱۹۶۷ء)، "محمد جاوید کی مصوری" از سیف اللہ (شمارہ ۲۷، ۲۰۱۳ء)، "مصوری اور صادقین" از محبوب اللہ (شمارہ ۸، ۱۹۶۷ء)، "جدید مصوری" از محمد عبد اللہ (شمارہ ۸، ۱۹۶۷ء)۔ مذکورہ مضامین کے مطالعے و تجزیے سے یہ بات اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ مضمون نگاروں نے فنِ مصوری پر مضمون لکھتے ہوئے مذکورہ فن کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں اور ان کے اثرات کی وسعت کو ملحوظ رکھا ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ کے مطابق الفاظ صرف اپنی نشست اور ترنم کے اعتبار سے قاری و ناظر میں شعورِ جمال کا باعث نہیں ہو سکتے ہیں، بلکہ الفاظ کی فنی ترتیب و تنظیم کے ساتھ ان کے معانی و مفاہیم کا ہونا بھی از حد ضروری ہے۔ مذکورہ مضمون نگاروں نے حصولِ جمالیات کے اس پہلو کو بھی اپنی تحاریر میں بہ خوبی نبھایا ہے۔ فنِ مصوری کے رموز و اسرار اور اثرات و جمالیات پر قلم فرسائی کرتے ہوئے قلم کاروں نے فنِ جمالیات کو اپنی تحریر میں بھی ملحوظ رکھا ہے، الفاظ و تراکیب کا ربط و ترتیب اور تفہیم و ترسیلِ معانی کے اعتبار سے مضامین قاری کے ذوقِ جمال کی تسکین اور اس میں افزونی کا باعث بھی ہیں۔ علاوہ ازیں، اردو ادب کے محقق زاہد ہمایوں کے مطابق جمالیاتی تحریک کی تین ممکنہ اشکال ہیں، اول تخلیق کو براہ راست دیکھ کر اس کی ظاہری ہیت کے حُسن سے اپنے حواس کے ذریعے تحصیلِ حظ، دوم کسی تخلیق کو دیکھ کر اس کی ظاہری ساخت اور اپنے شعور کے عمل دخل سے کسی دوسرے تصور یا شے کا وجدان ہو جانا اور سوم حواس اور وجدان کی متذکرہ صورتوں کے باہم مربوط ہونے سے

مسرت بخش تحریک کے ادراک کا ایک نیا سلسلہ قائم ہو جانا۔ سہ ماہی "سیپ" کے متذکرہ مضمون نگاروں نے فنِ مصوری پر اظہارِ مدعا کرتے ہوئے جمالیاتی تحریک کے ان تینوں پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ تصورِ حُسن متذکرہ تین پہلوؤں کے اظہار اور تفہیم سے تکمیل پاتا ہے۔ مذکورہ جریدے کے فنِ مصوری پر لکھے گئے مضامین بھی تصورِ جمال کے ان پہلوؤں سے تہی نہیں ہیں۔

ا۔ مصوری کی روایت کے مضامین:

رسم الخط اور فنِ تحریر کی ایجاد سے قبل عرضِ مدعا کا ابتدائی وسیلہ حرکات و سکنات تھیں جو کہ صفحہ قرطاس پر ہیت پذیر ہو کر مصوری کی بنیاد ہو گئیں۔ ماہرینِ فن کے مطابق پتھر اور دھات کے وجود سے بہت پہلے مصوری وجود میں آچکی تھی۔

جنگلی مخلوقات، نیم وحشی انسانوں اور خونخوار درندوں کے شکار کے مناظر اب سے ہزاروں سال اسپین کی مصوری میں مشابہ ہیں۔ جو کہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ آج سے ہزاروں برس پہلے بھی مصوری کا شمار مروجہ فنون میں ہوتا تھا۔

ایک فنکار کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ذوقِ جمال اور فنی کمال کو روز مرہ زندگی کے معاملات میں بر سر کار لایا جائے۔ تصویر اور تصویر کشی کا شوق ایک فطری عمل ہے۔ انسانی تاریخ اور مصوری کی تاریخ گویا ایک ہی ہیں۔ جس طرح انسانی تاریخ کے متعلق کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا بالکل اسی طرح اس فن کی تاریخ کے متعلق بھی با ضابطہ کوئی مکمل معلومات نہیں کہ اس فن کا آغاز کیوں، کب اور کیسے ہوا؟ تاریخ کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مصوری کا آغاز نقاشی سے ہوا کیونکہ تصویر ایک بیرونی عکس ہے جبکہ نقاشی اندرونی۔ اندرونی عکس کی نوبت بیرونی عکس سے ہمیشہ بعد میں آتی ہے۔ مصوری کا آغاز کسی ایک قوم سے نہیں ہوا بلکہ ایک ہی وقت میں کئی اقوام سے ہوا۔ تاریخ کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مصوری کا رواج مصر میں پڑا۔ حضرت مسیحؑ کی آمد سے پانچ ہزار برس پہلے اس کا آغاز ہوا۔ اگرچہ وہ وقت مصر کی اعلیٰ تہذیب و ثقافت کا نہ تھا۔ اگر تہذیب کے کچھ رنگ تھے بھی تو وہ مٹ چکے تھے۔ ماضی میں جھانکنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں جتنی بھی اقوام نے تصاویر بنائیں ان میں کثیر تعداد ان تصاویر کی ہے جو کہ ان کی نظر میں واجب الاحترام تھیں۔ اور ان کی تعظیم زیادہ تر مذہبی صورت میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ مصر، یونان، اسپین جو اس فن کے حوالے سے زیادہ اہم جانے جاتے ہیں وہاں

زیادہ تر مذہبی تصاویر گھروں میں آویزاں کی جاتی تھیں۔اس کے علاوہ قبروں میں رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے اوپر بھی آویزاں کی جاتی تھیں۔ تاکہ قبر کے معاملات میں آسانی رہے۔ تاریخی حالات و واقعات کے مطابق مصوری کا فن مصر سے یونان اور یونان سے اٹلی تک پہنچا۔ان میں بعض علاقے جیسے کہ یونان میں مصوری کو با قاعدہ فن کی حیثیت نہیں دی گئ۔اور نہ ہی ان کی ابتدائی تصاویر میں باقاعدہ ہیت یا رنگ سازی دکھائی دیتی ہے۔ مگر اس کے باوجود یونان فن مصوری کو دنیا کے سامنے لانے والے ممالک میں سرِ فہرست سمجھا جاتا ہے۔ یونانی مصوروں نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی تصویر سازی کو اتنا نمایاں کیا کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ فن دنیا کے سامنے مقبولیت اختیار کرتا گیااس میں موجود مذہبی جھلک کے اثرات کو کم کر کے اس میں دنیاوی اور قدرتی مناظر کو بھی شامل کیا گیا۔

فلسطین میں بھی اس فن کو مقبولیت حاصل ہوئی مگر یونان اور اٹلی کی نسبت وہاں زیادہ ترقی نہ کر سکا۔یونان میں فنِ مصوری کے پھیلنے اور ترقی کرنے کی دو اہم وجوہات تھیں۔ایک یہ کہ وہاں کے لوگ ذہین، محنتی اور اس فن کے شوقین تھے۔ جبکہ دوسری طرف حکومت وقت ان کی ہر طرح سے ممکنہ مدد کرتی۔ حکومت کی طرف سے فنکاروں کی مالی معاونت اور بھرپور حوصلہ افزائی اس فن کے پھلنے پھولنے کی اہم وجہ بنی۔ جس طرح روم کا ادب اور فلسفہ یونانی فلسفہ اور علم کا عکس کہا جاتا ہے اسی طرح اٹلی کی مصوری میں بھی یونانی رنگِ مصوری کی نمایاں جھلک دکھائی دیتی ہے۔

مصوری کی تاریخ کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آغاز میں زیادہ تر مذاہب میں اس کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا گیا۔ خاص طور پر عیسائی، یہودی اور مسلمان اس فن کے زیادہ مخالف مانے جاتے تھے۔خاص طور پر یونان جو کہ اس فن کو پھیلانے میں سرِ فہرست تھا۔ مذہبی حوالے سے اس فن کے خلاف خیال کیا جاتا رہا۔یونانی فنِ مصوری کے زوال کی بڑی وجہ بھی مذہب کو سمجھا جاتا تھا۔عیسائیت کی یورش یونان میں اس فن کو ختم کرنے کی بڑی وجہ بنی۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں میں عقل اور شعور آیا۔انھوں نے مذہب کی درست تعلیم حاصل کی تو اس کے بعد اس فن کے زوال میں کچھ کمی آئی۔ رفتہ رفتہ اس فن میں طاقت آنے لگی۔ یونان سے تمام دنیا کو اس فن کا عظیم خزانہ مل گیا۔ زمانے کے حالات میں تبدیلی اس فن کی ترقی کی وجہ بنی۔ مذہبی تعلیم، شعور اور سائنسی ترقی نے اس فن کو ابدیت بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔ عربوں نے اس فن کو بطورِ عکس متعارف

کروایا۔ ترکی میں فارسی، عربی خطاطی کی طرز پر اس کو پیش کیا گیا۔ اس ضمن میں عبدالرحمن چغتائی نے بڑی عمدہ بات کہی ہے:

> "فنون جمیلہ ہر جگہ مذہب کی گود میں پلے اور جوان ہوئے مگر عربوں اور ان کی تائید میں عجمیوں نے فنون کی بنیادیں صرف حکیمانہ اور فطری اصولوں پر کھڑی کیں۔"[۴]

قدیم تصویر نگاری کا مطالعہ کرتے ہوئے اس سچائی کا احساس ملتا ہے کہ موضوع، تکنیک اور علامات کے ضمن میں فنکار بے حد ذہین اور بیدار تھے۔ فنِ مصوری میں بڑے مسلمان مصوروں نے ایسے کمالات دکھائے کہ اس سے آنے والوں کے ذہن و شعور میں کشادگی پیدا ہوئی۔ اس سے فنکاروں نے فن اور فنکار کے درمیان وہ رشتہ پیدا کرنے کی کوشش کی جو عابد اور اس کے خالق کے درمیان ہوتا ہے۔

موضوع میں گم ہو کر تخلیقی عمل میں پُر اسرار منازل سے گزر کر تخلیق کی اعلیٰ ترین منزل پر پہنچنا ہی اہم کارنامہ ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں موضوع اور فنکار میں وحدت جنم لیتی ہے جو کہ تخلیق کو منفرد بنا دیتی ہے۔ یونانیوں نے اپنے خداؤں اور دیوتاؤں کی جو تصاویر بنائیں وہ انسانی حسن کا پیکر تھیں۔ ان کی مشابہت حسین و جمیل انسان سے تھی۔ اس کے برعکس ہندوؤں کی تصاویر میں ظاہری حسن سے معاورہ ان کے خداؤں کی صورتوں کی تصاویر کے ساتھ ساتھ ان کے مقدس جانوروں کی تصاویر بھی شامل تھیں۔ اسی طرح آتش پرستوں کی مصوری میں آگ اور اس کے اسباب کی تصویری جھلک دیکھنے کو ملتی تو سورج، چاند، ستاروں کی پرستش کرنے والوں کی تصاویر میں ان اجسام کا وجود لازم ہوتا مگر وقت اور حالات میں تبدیلی سے لوگوں کی فکر و عادات میں جدت پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں اس فن میں انقلاب آیا۔

تصویر بنانے والے کو چاہیے کہ انتخاب میں غلطی نہ کرے جو شے خود حسین نہ ہو اس کی تصویر میں کتنی ہی محنت کر لی جائے یا جتنے بھی رنگوں کا استعمال کر لیا جائے وہ کبھی بھی حسین نہ بن سکے گی۔ صرف یہی نہیں کہ اچھی شے کا انتخاب کیا جائے بلکہ فنکار کے لیے ضروری ہے کہ اگر وہ کسی بُری یا بد صورت شے کی تصویر بنا رہا ہے تو اسے بھی اس کے اصل رنگ میں ظاہر کرے۔ ہر جسم یا وجود میں بنیادی طور پر تین طرح کی کیفیات پائی جاتی ہیں جنہیں عمومی طور پر آن، آن بان اور شان کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ کیفیات بظاہر تو ایک دوسرے سے مختلف دکھائی دیتی ہیں مگر کبھی کبھی رنگ و روغن کی دنیا میں ان میں فرق کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک باکمال مصور ہی ان

تمام صورتوں کو الگ الگ اور جدا دکھا سکتا ہے۔ آن سے مراد ناز یا ادا ہے۔ عموما اس کا اطلاق حسین و جمیل مخلوقات پر کیا جاتا ہے۔ مگر اس سے محدود معنی یہ ہیں کہ دنیا کی تمام مخلوقات میں یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ شاعری میں اس کا مفہوم صرف انسانی جسم تک محدود ہے مگر درحقیقیت ادائے حسن دنیا کی تمام مخلوقات میں مو جود ہوتی ہے۔ ایک مصور اگر ایک مور کی آن اور دلکشی کو دکھائے تو وہ تصویر صرف مور کا خاکہ کہلائے گی۔ جانوروں میں بلاشبہ انسانوں کی مانند آن یا ادا کا وجود نہ ممکن ہے مگر ان کے حسن کی صحیح جھلک کے بغیر مصور کی تصویر کبھی دلکش نہیں کہلائے گی۔ مور کے رنگ، اس کا حسن، رقص کا دلکش انداز تصویر کو بارونق بنادے گا۔ ہر دیکھنے والا اس سے محظوظ ہوسکے گا۔

مسلمانوں نے مغل دور میں فنون کو بڑی وسعت دی، سولہویں اور سترہویں صدی کے دوران شاہ جہاں اکبر اور جہانگیر کی نگرانی اور مالی معاونت نے فنکاروں کے کام کو دوام بخشا، شاندار مغلیہ دور کا آغاز اس وقت ہوا جب بابر نے لودھی خاندان کی اینٹ سے اینٹ بجاکر برصغیر پاک وہند میں اپنی کامیابی کا جھنڈا لگایا، یہ کامیابی بر صغیر کی تاریخ میں "نئے باب" کا آغاز ثابت ہوئی، مغل بادشاہوں نے حسین و جمیل باغات لگوائے، جن میں بیش بہا پھول اور پھل تھے۔ مختلف ممالک سے اعلیٰ پائے کے بیج منگوا کر انواع واقسام کے باغات لگوائے اس کے علاوہ مسجدیں، مقبرے اور دیدہ زیب و دلکش محلات تعمیر کروائے۔ مغلیہ دورِ حکومت کو فنون کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ مغلیہ دور کو فنون کے مکتب کا نام دیا جاتا تھا۔ جس کی جمالیاتی ترقی مستقبل میں بھی لوگوں کو متاثر کرتی رہے گی۔ مغلیہ دور اگرچہ مختصر تھا، مگر خوشحال اور دلکش دور تھا۔ محبوب اللہ اپنے مضمون "مغل فن مصوری" میں رقم طراز ہیں:

> " مغل سرپرستوں نے اپنے دور میں ہر چیز کو انتہا تک پہنچایا۔ عمارت کو چھوڑ دیجیے اور مصوری پر آجایئے ان کی بنائی ہوئی ایک تصویر پر یورپ سے آنے والا ایک سیاح انگشتِ بدنداں رہ گیا۔ اور اس کی نقل شدہ تصویر میں تمیز نہ کرسکا۔۔۔۔۔ یہ فعل قوم کا نصیب تھا اور یہ ان کا کارنامہ "[۵]

اکبر مصوری کے سرپرست سے زیادہ اس میں سند کا درجہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دور میں ہر طرح سے مصوروں کو مراعات دیں اور اس انداز میں حوصلہ افزائی کی کہ وہ جاندار انداز میں اپنی تخلیقات پیش کرسکیں

۔اکبر کی تصویر کشی سے دلچسپی دیدنی تھی۔انہوں نے کئی بار دوسرے ممالک سے بھی مصور بن کر مدعو کر کے اپنی تصویر اپنی تصاویر بنوائیں۔اس ضمن میں وہ مصوروں کی بھرپور حوصلہ افزائی بھی کیا کرتے تھے۔کئی غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل مصورین اس کے دربار سے منسلک تھے۔جن کی تصویر کسی عمدہ جمالیاتی مظاہرہ کا نمونہ تھیں۔ محبوب اللہ، اپنے مضمون "مغل فن مصوری" میں لکھتے ہیں۔

" مغل فنِ مصوری نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک خوشگوار فضا پیدا کی۔اور یہاں کی مصوری کے لیے ایک حسین حادثہ ثابت ہوئی۔کچھ مصورین نے اس تاریخ میں حسین اضافے کیے۔اور ان اضافوں سے چل کر یہاں کی مصوری ایک خوبصورت قالب میں ڈھل گئی۔ مغل مصوری نے خصوصیت سے تزئین کاری، شیشہ سازی اور مختصر شبیہ سازی کی بنیاد رکھی۔اور وہ یہ کہ تزئین کاری، شیشہ سازی اور مختصر شبیہ سازی ان کی اپنی روایت میں سے تھی۔یا انہوں نے کسی سے مستعار لیا۔اور اگر مستعار لیا بھی تو کن کن ہاتھوں سے ہوتی ہوئی وہ یہاں تک پہنچی۔اور ہندوستان آنے تک اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں"[٦]

شاہ جہاں کے دور میں فعل مصوری کے اسلوب کو پذیرائی ملی۔بڑی تعداد میں مصوری اور خطاطی کے فن پارے سامنے آئے تھے۔بھرپور حوصلہ افزائی اور پذیرائی نے مصورین کے حوصلے بلند کر دیئے اور انہوں نے بادشاہوں کی تاریخ کو تصاویر میں منتقل کر دیا۔جو کہ تاریخ کے باب میں خوبصورت اضافہ تھا۔

مغل تہذیب و ثقافت کو ایک ہمہ گیر عظمت اور حس عطا کرے والی اشیاء میں خود مغل قوم کا مذاق مسلم اور مذاق حسن ان کی بنائی ہوئی پر شکوہ اور دلفریب پینٹنگز، مجسمے اور عمارتیں اور اس کی سرپرستی پیدا ہونے والا ادب ان کے دربار سے منسلک گیت وسنگیت ان سے قبل اور بعد میں آنے والے مصوروں، خطاطوں اور موسیقاروں نے فنون کو عروج تک پہنچایا۔ان کے بنائے ہوئے، قلعے، مقبرے اور دوسری دلفریب اشیاء اپنے مجموعی روپ اور صفات کے ساتھ دنیا کے سامنے مغل تہذیب و ثقافت کی صورت میں نمودار ہوئیں۔ مغل دورِ حکومت فنونِ لطیفہ کی تاریخ کا سنہری دور تھا۔اس دور میں فنون کو جتنا عروج حاصل ہو اوہ آنے والے دور میں شاید کبھی نہ مل سکے۔

۲۔ شخصیتِ مصور پر مضامین:

تاریخ میں فنونِ لطیفہ کے ارتقاء یا تجدید کی جب بھی بات ہوئی ہرات کا نام لازمی آئے گا۔ سلطان حسین مرزا تیرہویں صدی کا ہرات تاریخ کے صفات میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ چودھویں صدی میں تزئین و آرائش کو مقبولیت حاصل ہوئی اور سلطان کے وزیر اعظم میر علی شیر انوالی نے فنون لطیفہ کی ترویج اور فنکاروں کی تربیت کے لیے جتنے اقدامات کیے تاریخ میں شاید ہی کسی نے ذاتی طور پر فنون لطیفہ میں اتنی دلچسپی لی ہو۔ انہوں نے فنکاروں کی حوصلہ افزائی اس انداز میں کی کہ ان کا فن نکھر کر سامنے آیا۔ دنیا میں بیزاد جیسے عظیم مصوروں کے نام سامنے آئے۔ بیزاد نے اپنے فن پاروں میں اس کمال کا مظاہرہ کیا کہ مغلیہ دور میں ان جیسا عظیم مصور دوبارہ پیدا نہ ہو سکا۔ ہرمیٔ براؤن اپنی کتاب میں بیزاد کے متعلق رائے دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"مشرق کے لیے بیزاد کی وہی اہمیت ہے جو مغربی مالک کے لیے ریفائلی کی ہے"۔[۲]

بیزاد نے نہ صرف خود فنون کی دنیا میں نام پیدا کیا بلکہ سید علی اور منصور جیسے بڑے مصوروں کو متعارف کروایا۔ اکبر، ہمایوں، شاہ جہاں، بابر نے تخلیق کاروں کے فن کو دنیا کے سامنے بڑے دلکش انداز میں پیش کیا۔ انہوں نے فنون کو زندگی کی میراث قرار دیتے ہوئے دنیا کو اس بات سے روشناس کروایا کہ جذبات و احساسات کا اظہار صرف الفاظ سے ہی ممکن نہیں بلکہ بعص مقامات پر ذات و حسن کے لیے فن پاروں کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ تصویریں زبان نہ رکھنے کے باوجود پہلی ہی جھلک میں دیکھنے والے کے لیے کئی پیغامات چھوڑ دیتی ہے۔ وہ تصاویر کبھی معاشرتی بے راہ روی کی داستان سناتے ہیں تو کبھی لوگوں میں امید اور یقین کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تصویر کشی کا ایک خوبصورت پہلو یہ بھی ہے کہ تصویر چاہے کسی بھی ملک کے فن پارے کا شاہکار ہو وہ زبان کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ گویا تصاویر کے ذریعے سے پوری دنیا میں ہر قسم کے پیغامات کو پہنچانا ممکن ہے۔ حسن و رعنائی سے بھرپور تصاویر دیکھنے والوں کو مصور کی سوچ کا پتہ دیتی ہیں۔ حفیظ انیس اپنے مضمون "تخلیق اور تخلیق کار" "میں لکھتے ہیں۔

> ”ان کی فطرت نگاریوں میں وہ پر شوق ولولہ موجود ہے، جو اس نئے زمانے کی تصاویر مناظر قدرت میں نظر آتا ہے، اور دھوپ چھاؤں کی جاں فزا کیفیات دکھانے کا انہیں خاص ملکہ تھا۔ جہاں مصور نے انسانی شبیہیں اتاریں

وہاں اس کے جسد انسانی کے پر غور مطالعہ کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی باریک نگاہی،
اس کے مشاہدے کی صفائی، اس کا کمال خط کشی اور اس کے چہرے سے جذبات دل
کے اظہار کی قابلیت نے باہم مل کر ایسی تصویریں بنائی ہیں جو مغرب کے چھوٹے
پیمانے کی بہترین تصاویر سے آنکھ ملا سکتی ہے۔"۸

تاریخی مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر دور میں ایسے عظیم فن کاروں نے جنم لیا جن کی مثال نہیں ملتی ان ہی میں ایک نام پبلو پکاسو کا ہے۔ دنیائے فن کے اس عظیم مصور کا تعلق ہسپانوی قوم سے تھا۔ اس کا طرزِ مصوری اس وقت کے دیگر فنکاروں سے قدرے انوکھا اور منفرد تھا۔ پکاسو کے اندازِ مصوری میں آئل پینٹنگز اور روغنی مصوری زیادہ تر دیکھنے کو ملتی ہے۔ مصوری کے حوالے سے پکاسو کا نظریہ تھا کہ تصویر کشی صرف گھر کو خوبصورت بنانے کا نام نہیں بلکہ اس کا مقصد جذبات کی بیداری بھی ہے۔ دشمن کے خلاف نفرت ابھارنے یا اپنوں میں محبت کی شمعیں جلانے کا بہترین اور پائیدار ذریعہ مصوری ہے۔ پبلو کی مصوری میں تصویر کو نمایاں حیثیت حاصل ہے اسکا خیال ہے کی مصوری صرف ضرورت کے تحت تصویر سامنے رکھ کر کی جاتی ہے۔ اس میں لوگوں کے معیار اور ان کی ذہنی سطح کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں مگر اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ کوئی مصور کسی عکس یا تصویر کے بغیر کوئی فن پارہ تخلیق نہیں کر سکتا۔ یہ سوچ صرف ایک خیال ہے جس کا دور تک حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس ضمن میں حفیظ انیس اپنے مضمون " تخلیق اور تخلیق کار " میں لکھتے ہیں:

" اب تصویر ایک ایسی کھڑکی نہیں رہی جس سے انسان قدرت کے خواب آگیں نظارے
دیکھ سکے اور نہ ہی وہ تصویر کسی آرٹسٹ کے ذاتی جذبات اور احساسات کی توجیہہ ہے جو خود
پسندی کا شکار ہے۔۔۔۔ تصویر کو بذاتِ خود ایک ہستی ہے ایک اثبات ایک ایسی نئی و
حدت ہے جو حسن کے تصور کو پیکراں کرتی ہے۔ جب ایک شکل آپ کے حواسِ خمسہ
پر اعلیٰ تاثر چھوڑے گی تو آپ روح کے معنی بھی سمجھ جائیں گے "۹

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حسن کا اظہار کیا ہے؟ اور قوت کا اظہار کیا ہے؟ ان دونوں کے علیحدہ علیحدہ معنی اور اظہار ہیں۔ حسن کا اظہار حواسِ خمسہ کے لیے ہے اور قوت کا اظہار روح کی بالیدگی کے لیے ہے۔ اس ضمن میں حفیظ انیس اپنے مضمون " تخلیق اور تخلیق کار " میں لکھتے ہیں:

"روح کا وجود پکاسو کا معیار کبھی نہ تھا وہ تو بس اعضاء، چہرے اور جسم میں مصور، ناظر کی انا پا تا تھا حالانکہ روح کے باطن سے ہی حسن کے سارے چہرے جنم لیتے ہیں۔ کینوس ویسے بھی مادی کیفیات کا دورخی اظہار ہے۔ اس مناسبت سے مادی جسم بھی اپنی محدود کیفیات کا اظہار کر جاتے ہیں۔"[10]

پکاسو کی مصوری میں جو عکس نظر آتے ہیں اس میں معاشرے کے ناہموار اور عام زندگی کے مسائل سرِ فہرست ہیں۔ ان کی زندگی میں کہیں اذیت، بے بسی اور تنہائی نظر آتی ہے۔ تو کہیں دولت کے بچاری معاشرے میں موجود حرص و حوس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس کے ہاتھ جب بھی کینوس کی جانب بڑھے تو کچھ ایسا منفرد رنگ جمایا کہ دیکھنے والا اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔ اس ضمن میں حفیظ انیس اپنے مضمون "تخلیق اور تخلیق کار" میں رقم طراز ہیں:

"آپ کمال مہارت کے ساتھ زمان و مکاں، چہروں کے تاثرات، فن خطاطی وغیرہ کو دیکھنے والوں کے سامنے لاتے ہیں۔ یہ فن پارے دیکھنے والوں پر ایسے تاثرات چھوڑتے ہیں کہ وہ خود کو اسی فضاء اور زمانے میں محسوس کرتے ہیں۔ میرے خیال میں بڑا تخلیق کار وہ ہی ہوتا ہے جو اپنے چاہنے والوں پر مذکورہ تاثرات چھوڑے۔"[11]

مصوری ایک پر مسرت معاشرے میں جنم لے سکتی ہے۔ اس کے لیے پکاسو جیسے اپنی تخلیقی سوچ رکھنے والے آرٹسٹوں کے کام کو قومی اور عوامی سطح پر عام کیا جائے تا کہ معاشرے میں بڑھتی ہوئی گھٹن کو کم یا ختم کر کے ایک حقیقی پر مسرت معاشرہ جنم لے سکے۔

فنونِ لطیفہ کا تعلق انسان کی جمالیات سے براہ راست ہوتا ہے۔ اس مضمون میں محبوب عزمی نے عباس شاہ کے آرٹ کی جمالیاتی اقدار کو اجاگر کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ اس مضمون کی خاص بات یہ ہے کے مصنف نے مصوری کی مختصر سی تاریخ بیان کرتے ہوئے مصوری کے ماضی اور موجودہ مصورانہ جمالیاتی اقدار کو بیان کیا ہے تا کہ قارئین اور ماہر فنون لطیفہ جدت کے اس تناظر سے واقف ہو سکیں۔

اگر مصوّر اپنے فن میں کامل ہو، تو بات کو کچھ اس رُخ سے بیان کرتا ہے کہ ہمہ تن گوش قاری اور ناظر دوسرا رُخ دیکھنے کے لیے تڑپ اُٹھتا ہے۔ جب ایسے کامل مصوّر کی بات کی جائے کہ جو احساس کو لکیروں کی مدد سے آشکار کر

دے، تو جو چند نام سب سے پہلے ذہن میں آتے ہیں، اُن میں سے ایک "پبلو پکاسو" بھی ہے۔ ایک ایسا فن کار، جس کی تخلیق تہہ در تہہ اور پرت در پرت معنی و مفاہیم کی دُنیائیں دریافت کرتی ہے۔ ایک ایسا فن کار، جس کی سرشت میں موجود کرب، اضطراب اور سینے میں لگی آگ اُس وقت تک ٹھنڈی نہیں ہوتی کہ جب تک اُسے تخلیق کا پُر شور پانی بُجھا نہیں دیتا۔ ایک ایسا فن کار، جو کائنات کو تخیّل کی آنکھ سے دیکھتا، مفکّر کے ذہن سے سوچتا اور مصوّر کے قلم سے سمجھتا ہے۔

پکاسو کے اعلیٰ تخیل سے معاشرے کی جبریت کی بنتی ہوئی تصویروں کو پیش کیا ہے مصنف نے بہت خوبصورت انداز میں مصوری کے ہنر کی عکاسی کی ہے کہ ہر رنگ کا ایک سائن ہوتا ہے جو مصور علامتی طرز اپنائے مصوری کو معاشرے کی جمالیاتی حس سے جوڑتے ہوئے مختلف رنگوں کی صورت میں بکھیرتا ہے۔ مصنف نے پبلو پکاسو کے ہاں مصوری کی جدید عمرانی و سیاسی صورتحال کا تجزیہ کر کے قارئین کو مصوری کی جدید و موجودہ صورتحال سے آگاہ کیا ہے تا کہ فنون لطیفہ (مصوری) کے ارتقائی و تشکیلی سفر میں نئی جہات سامنے لائی جا سکیں۔

مائیکل اینجلو فنونِ لطیفہ کی اہم ترین شہرت یافتہ شخصیت کے طور پر مانے جاتے ہیں۔ وہ اپنے ہم عصر ہونا روڈ واونسی کے فن سے متاثر تھے۔ اونسی کے فن کی نمایاں جھلک مائیکل اینجلو کے فن پاروں میں دکھائی دیتی ہے۔ مایا کے تخیل اور مصورانہ ذہن میں دنیا فانی کا تصور نہایت منفرد اور اثر انگیز تھا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین اپنے مضمون "مغرب میں مصوری" میں لکھتے ہیں:

> "مائیکل اینجلو اپنے زمانے کا وہ واحد فنکار اور مصور تھا جس کی مصورانہ کامیابیاں مؤثر ثابت ہوئیں۔ اس نے انسانی مساعی کے ہر مختلف شعبے میں کامیابی حاصل کی تھی اور اس وجہ سے اس کا شمار صفِ اول کے فنکاروں اور مصوروں میں ہوتا تھا۔"[۱۲]

مائیکل اینجلو کے ہر کام میں نفاست، عمدگی اور دلکشی کی واضح جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس نے کئی نایاب تصاویر، دھیمی پینٹنگز اور عمدہ فن پارے تخلیق کیے۔ اس کے شہ پاروں اور فن پاروں کا ایک قیمتی ذخیرہ تھا جو کہ آج تک مصوروں اور فن کے مداحوں کے لیے ذوقِ تسکین کا باعث ہے۔ اس کے فن پاروں نے یورپی مصوری کے رنگ وروپ پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ مصوری کے علاوہ مائیکل اینجلو ایک شاعر اور ادیب بھی تھا اس کا نثری اسلوب حیران کن انداز تک متاثر کن تھا اس کے نثری اسلوب کے ذریعے اس کی شخصیت کے کئی پر اسرار

راز دنیا کے سامنے کھلتے ہیں۔ اس کی تحریروں میں جہاں ایک طرف موسیقی کا ترنم ہے تو وہیں دوسری طرف معاشرتی آہ و فغاں سنائی دیتی ہے۔ ان کے اسلوب میں کہیں زندگی خوبصورت اور حسین وادیوں کی مانند ہے تو کہیں پر خار راستوں میں الجھے مسافروں کی طرح بھٹکتی دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مائیکل اینجلو نہ صرف ایک کامیاب مصور کے طور پر سامنے آیا بلکہ مشہور ادیب اور شاعر کی حیثیت سے بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

راجہ روی ورما کا نام بھی برصغیر پاک و ہند کے نامور مصوروں میں لیا جاتا ہے۔ ان کو یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ وہ بھارت کے پہلے فنکار ہیں جنہوں نے تمام دیوتاؤں کے مجسمے بنائے یہ اس وقت کی بات ہے جب یورپی مصوری جذبات کے اظہار کا مؤثر ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ مگر ہندوستانی مصوروں کو وہ مذہبی آزادی نہ تھی جو کہ باقی مذاہب میں موجود تھی۔ چناچہ ہندوستانی اور یورپی مصوری کے ملاپ سے روی ورما نے ایک خوبصورت اور خوبصورت تخلیق کی۔ اس نے اپنے روغنی رنگوں سے کئی دیوتاؤں اور بڑی شخصیات کی یادگار تصاویر بنائیں جو کہ اس وقت کے راجاؤں اور مہاراجوں کے درباروں کی زینت بنی۔ روی ورما جنوبی ہند کی حسین و جمیل خواتین کے حسن سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے جنوبی ہند کے حسن کو مدِ نظر رکھ کر انہیں ہندی دیوتاؤں کا مصورانہ روپ دیا۔ اور پھر اس دیوتاؤں کے حسن و جمال اور رنگ و روپ کو قدرت کا عمدہ اور منفرد شاہکار قرار دیا۔ انعم جاوید اپنے مضمون "جدید مصوری" میں چترا پریتم کے مصورانہ انداز کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "راجہ روی ورما کی مصوری میں عورت کا آرچ ٹائپ ہے جسے یونگ نے سول امیج (Soul Image) کہا ہے اور روی ورما نے عورت کے پورے جمالیاتی نقش کو اس کی تمام تر کیفیات کے ساتھ کینوس پر اتارا ہے۔ عورتوں کی Paintings میں راجہ روی ورما نے اتنے جمالیاتی ارتعاشات پیدا کر دیئے ہیں کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ ان کی پینٹنگس کی موہنی ہو یا دمینتی، شکنتلا ہو یا کوئی اور سب ونڈرفل نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنی مصوری میں عورتوں کو Seductress اور Tempress کی حیثیت سے بھی پیش کیا ہے اور موج خیز بدن کے نشیب و فراز، جمالیاتی زاویوں مخفی عبارتوں، سینے کے تناؤ میں پکھاوج کی ترنگ، روانی روش اور مستی ادا کو کینوس پر کچھ اس خوبصورتی سے اتارا ہے" ۱۳

ورٹریٹ پینٹنگس میں انہیں درک کامل تھا۔ انہیں اتنی مہارت تھی کہ بڑی سے بڑی شخصیتیں بھی راجہ روی ورما کے اس ہنر سے مسحور تھیں۔ ماسٹر پینٹر آف پورٹریٹس کی حیثیت سے انہیں عالمی شہرت حاصل تھی۔ ان کے پورٹریٹ اتنے خوبصورت ہوتے تھے کہ میسور کے مہاراجہ نے اپنے اور اپنے خاندان کے پورٹریٹ کے لیے ۱۸۸۵ میں انہیں خاص طور پر مدعو کیا۔ بڑودا کے گائیکوار کی خصوصی دعوت پر انہوں نے وہاں کئی سال گزارے۔ راجہ روی ورمانے ہی اودے پور کے مہارانا اور ان کے پیش روؤں کے پورٹریٹ بنائے۔ روی ورمانے مہارانا پرتاپ کا جو پورٹریٹ بنایا ہے، اسے شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ اسی سال انہیں قیصر ہند گولڈ میڈل عطا کیا گیا۔ راجہ روی ورمانے مختلف پس منظروں سے تعلق رکھنے والی عورتوں کے پورٹریٹ بھی بنائے اور ان میں عورتوں کا حسن نہایت ہی دلفریب، جانفزا، مسحور اور مدہوش کن نظر آتا ہے۔ راجہ روی ورما کو پورٹریٹ آرٹسٹ کی حیثیت سے اس وقت شہرت ملی جب ۱۸۷۰ اور ۱۸۷۸ کے دوران انہوں نے برطانوی افسران اور ہندوستانی ارسٹوکریٹس کے پورٹریٹ بنائے۔ پورٹریٹ بنانے کی وجہ سے انہیں اتنی شہرت ملی کہ کلمنور جیسے چھوٹے گاؤں میں حکومت کو پوسٹ آفس کھولنے پر مجبور ہونا پڑا۔ کیونکہ غیر ممالک سے پورٹریٹ کی فرمائشیں آتی تھیں۔ پورٹریٹ میں راجہ روی ورمانے تنجور (Thanjavoor) روایت کے اسالیب اور یوروپی حقیقت پسندی کے عناصر کا خوبصورت امتزاج پیش کیا۔ انہوں نے اپنے پورٹریٹ میں تنجور کی روایت کا احترام ملحوظ رکھا۔ اس دبستان مصوری میں نسائی جذبات کو مرکزی خیال کی حیثیت حاصل تھی۔

راجہ راوی ورما کے فن پاروں، میں ہر عمر اور ہر طبقے کے کسی نہ کسی پہلو کہ جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پورے ہندوستان میں ان کو یکساں طور پر تحسین وستائش کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی خداد صلاحیتوں کے عوض ان کے نام پر حکومت ہندوستان نے ایک ادارہ بنایا ہے جو کہ ہر قسم کے فنون سے دلچسپی رکھنے والوں کو تعلیم وتربیت فراہم کرتا ہے۔ حکومت ہندوستان نے ان کو ۲۰۰۰ء میں "راجاروی ورماپورس کارم" نامی اعزاز بھی دیا اور انہی کے نام سے منسوب یہ ایوارڈ اب ہر سال فنونِ لطیفہ کے کسی شعبے میں نمایاں خدمات سرانجام دینے والوں کو دیا جاتا ہے۔

فنونِ لطیفہ میں استادی شاگردی کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن درسگاہوں کی شکل اختیار کرنے سے پہلے شاگرد ہمیشہ استاد کے نام کا دم بھرتے رہتے تھے اور درسگاہوں نے انھیں اسی دباؤ سے نکالا۔ پہلے استاد کوشش کرتے تھے کے

شاگرد کو ایسا کر دیں کہ وہ خود کو تلاش کرنے کے راستے پر چلنے کے قابل ہو جائے۔ استاد شاگردوں پر کھلے رہتے تھے، اس لیے نہ تو کچھ چھپاتے تھے نہ بتاتے تھے۔ شاگرد اپنی بساط کے مطابق جو ممکن ہو تا حاصل کر لیتے۔ ایسے بھی شاگرد ہوئے جن کے سوالوں نے استادوں پر نئے راستے کھولے اور ایسے بھی شاگرد ہوئے جو فنافی الاستاد ہو رہے۔ چترا پریتم ان سب طریقوں کا آمیزہ ہیں۔ انعم جاوید اپنے مضمون "جدید مصوری" میں چترا پریتم کے مصورانہ انداز کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "چترا پریتم کے کام کا اگر بغور جائزہ لیں تو اسے چھ خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، لیکن ان مختلف خانوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ تمام خانے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں، اگر چترا پریتم آپ کو بدھا میں خود کو تلاش کرتا نظر آتا ہے تو دوسری طرف قرآنی آیات اپنے کینوس کی زینت بناتا ہے، کسی جگہ وہ میرا کے عشق لازوال کی مالا پروتا ہے تو کہیں اپنے اندر بسی ہوئی مٹی کے سوندھے پن کو لینڈ اسکیپ کی صورت میں مجسم کرتا ہے، اپنے کراچی کے سفر کو وہ سمندر کی لہروں پر ابھرتی، ڈولتی کشتیاں بنا کر رقم کرتا ہے۔"[۱۴]

چترا پریتم کی پینٹنگ میں مصور کی رنگینی کے منفرد احساس کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے، وہ صبر اور جلدی کے بغیر تہوں میں پینٹ کرتا ہے۔ چترا پریتم کے فن پاروں کو دیکھ کر ناظرین پر دائمی سکون کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ چترا پریتم کے فن کا ایک لازمی حصہ ''لائن۔'' ہے، اس کے ساتھ رنگ، شکل اور ساخت کا ایک عمدہ امتزاج ہے میں ایک بڑی تعداد میں پینٹ اس نے بہت سے مضامین کو دیہی منظر نامے اور کشتی رانی کے سمندری مناظر کو کیا ہے جس پر میں چترا کو مبارکباد دیتا ہوں۔ چترا پریتم اپنے سفر پر گامزن ہے اور ایک کے بعد ایک منزل طے کرتا چلا جارہا ہے۔ فنافی الاستاد ایسے ہیں کہ جمیل نقش کے نام سے بات شروع کرتے ہیں اور انھی کے نام پر ختم کرتے ہیں۔ جمیل نقش کی دوری نے بھی ان کے اِس جذب میں کوئی فرق پیدا نہیں کیا۔ ان کی ہر تصویر، تصویر کی ہر لکیر، ان کے رنگ اور رنگ کا ہر شیڈ، یہاں تک کے ان کے ہاتھ کی خفیف سے خفیف جنبش تک اسی جذو اور تلاش کا اظہار محسوس ہوتی ہے۔ کیا یہ اس بات کی تصدیق ہے کے بڑے درختوں کے سائے اگنے والے پودے تناور درخت نہیں بنتے؟ بہت سے لوگ ضرور چترا پریتم کے بارے میں یہی سوچتے اور محسوس کرتے ہوں گے۔

اس کی خطاطی، اس کے لینڈ سکیپ اور اس کی نسائی چہروں والی تصویریں بہت سے لوگ اس لیے خریدتے اور رکھتے ہوں گے کہ اگر جمیل نقش کی تصویریں خریدنے کی بساط نہیں تو چترا کی تصویریں لے لیں۔

اطالوی مصوری کی دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک مصور موجود ہے، جنہوں نے آرٹ کی دنیا پر حکمرانی کی، لیکن ایسے مصور بھی ہیں، جنہیں زندگی نے مہلت کم دی، لیکن پھر بھی آرٹ کی دنیا میں انہوں نے اپنی قابلیت کا سکہ چلایا۔ رافیل بھی ایسا ہی نبض شناس مصور تھا، جس نے زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ایسے شاہکار متصور کیے، جن کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔۔ انعم جاوید اپنے مضمون "جدید مصوری" میں رافیل کے مصورانہ انداز کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "حسین چہرے، جمیل نقوش، چمکتی آنکھیں، مخروطی انگلیاں، صراحی دار گردن، بلبل کا لہجہ، کوئل سی میٹھی آواز، رنگین ملبوسات، لذت سے بھرے لمحے، اور تشنہ خواہشوں کے سراب: کیا کچھ نہیں ہے اس کی پینٹنگز میں، صرف محسوس کرنے کی بات ہے۔ بولتی ہوئی تصویریں، جلتے ہوئے رنگ، مصوری کے چاہنے والوں کے اضطراب کو کچھ اور بڑھا دیتے ہیں"[۱۵]

رافیل کی پیدائش ۱۴۸۳ جبکہ وفات ۱۵۲۰ کی ہے۔ زندگی نے اس کو صرف ۳۷ برس کی مہلت دی، مگر اس میں بھی رافیل نے اپنے فن کو ثابت کر دیا۔ اس نے ایسے کرداروں کو پینٹ کیا، جن کو ہم صرف تخیل میں سوچ سکتے ہیں، جن سے ملاقات صرف خوابوں میں ہو سکتی ہے، مگر ان خوابیدہ نقوش کو رافیل نے کینوس پر ایک زندہ حقیقت میں ڈھال دیا۔

ب۔ موسیقی:

تعارف:

موسیقی عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی ہے گانے بجانے کا فن یا وہ اصول و ضوابط ہیں جن میں سروں کی ترتیب پر بحث کی جاتی ہے۔ موسیقی ایک تخلیقی سرگرمی ہے۔ جسے مصوری اور دوسرے فنون لطیفہ کی طرح انسان کی ابتداء میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ موسیقی کے حوالے سے ماہرین کی مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ کوئی اس کو جذبات سے بھرپور آواز قرار دیتا ہے تو کوئی اسے دل کو چھونے والی آواز کہتا ہے۔

سہ ماہی "سیپ" میں فنِ موسیقی پر مختلف شمارہ جات میں متفرق مضامین کی اشاعت ہوتی رہی ہے، تجزیے کے لیے منتخب کردہ مضامین یہ ہیں: "ہندوستان کا فنِ موسیقی" از محمد اختر (شمارہ ۳، ۱۹۶۵ء)، "موسیقی کے قدیم ساز" از امین عباسی (شمارہ ۸، ۱۹۶۷ء)، "ہماری موسیقی" از قیصر قلندر، "موسیقی اور موسیقار" از علی جعفری (شمارہ ۱۰، ۱۹۷۰ء)، "موسیقی کی ایجاد" از ڈاکٹر جواز علی (شمارہ ۱۶، ۱۹۷۲ء)، "علمی رنگ میں موسیقی" از احمد علی (شمارہ ۱۷، ۱۹۷۳ء)، "کلاسیکی گھرانوں میں موسیقی" از جواز علی جعفری (شمارہ ۱۹، ۱۹۷۵ء)، "موسیقی کا ارتقا" از عرفان احمد (شمارہ ۶۲، ۲۰۱۳ء)، انسان اور موسیقی" از مرزا سلطان احمد (شمارہ ۷۴، ۲۰۱۵ء)۔

فنِ موسیقی سننے والے کی جمالیاتِ سماعت کو حظ پہنچاتی ہے، سُر، تال اور لے کے اتار چڑھاؤ سے بننے والی نغمگی اور مترنم اصوات کا منظم تسلسل سماعت کی آسودگی کا سبب بنتا ہے، نیز بعض صورتوں میں ذوقِ عمل بھی مہیا کرتا ہے، اسی طرح موسیقار انگلیوں کی مخصوص و متواتر حرکات سے ایک خاص آہنگ کی آوازیں بکھیرتے ہوئے اپنے حسِ جمال کا اظہار کرتا ہے۔ خاص آہنگ میں مربوط آوازوں کے زیر و بم سے مترشح معانی و مفاہیم کی بازگشت موسیقی کے حُسن و جمال کو بڑھاتے ہوئے شعور و لاشعور میں افکارِ نو کی بنیاد کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ سازِ موسیقی کی مخصوص بازگشت، اصوات کے آہنگ و ترنم سے فضائے موسیقی وجود پذیر ہوتی ہے۔ سازوں کے تفاوت اور مخصوص و متفرق انداز سے مختلف النوع فضائے موسیقی متشکل ہوتی ہے، ہر ساز اور ساز کے نتیجے میں بننے والی فضا اپنے موسیقار کے ذوقِ جمال کی عکاسی کرتی ہے، مختلف آہنگ، سُر، لے اور تال سے بننے والے ساز محض منظم آوازیں نہیں ہوتی ہیں، بلکہ یہ مترنم و منظم اصوات اپنے اپندر جہانِ معانی سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں۔ ساز، فضا اور معانی و مفاہیم کے ظاہری و پس ظاہری تعلق سے فن کار جمالیات کے تین پہلوؤں (ظاہری و حسی حظ، وجدانی حظ، تدارکِ نو کا حظ) پر محیط موسیقی تخلیق کرتا ہے، مزید بر آں سامعین اپنی استعداد کے مطابق تفہیم کے مراحل سے گزرتے ہوئے فن سے لُطف اندوز ہوتے ہیں، نیز اپنے شعور و وجدان کے مطابق موسیقی کے آہنگ سے اپنا کتھارسس کرتے ہوئے کشیدِ مسرت کرتے ہیں۔

ا۔ فنِ موسیقی کے مضامین:

موسیقی کا ارتقاء کسی بھی دوسرے فن کے ارتقاء سے مختلف نہیں ہے۔ سائنسدانوں کے خیال میں موسیقی کا ارتقاء بھی نباتاتی اور حیواناتی ارتقاء کی طرح ہوا۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کے نزدیک جتنے بھی قدیم

مقامات دریافت ہوئے ہیں ان میں کہیں نہ کہیں موسیقی، مصوری اور خطاطی کے عکس ضرور دکھائی دیتے ہیں ۔سُر اور لے کی زبان موسیقی ایک ثقافتی پیداوار ہے جو کہ فنکارانہ اظہار کا اہم ذریعہ ہے۔ اگرچہ موسیقی کی پیدائش کے سلسلے میں موجودہ ترقی یافتہ دور میں بہت سے نظریات سامنے آئے ہیں مگر در حقیقت موسیقی اس وقت جنم لیتی ہے جب کسی زندہ تخلیق پر جذبات غالب نہ آجائیں اور کچھ مقررہ ادارے ہیں جنہیں انسانی تہذیب و ثقافت کے لیے لازم سمجھا جاتا ہے جو موسیقی کو حیوانی دنیا کی پکاروں اور آوازوں سے جدا کرتے ہیں۔ سہ ماہی "سہ ماہی سیپ" میں فنِ موسیقی کی تاریخ و ارتقا پر شائع ہونے والے مضامین "ہندوستان کا فنِ موسیقی" از محمد اختر (شمارہ ۳، ۱۹۶۵ء)، "موسیقی کے قدیم ساز" از امین عباسی (شمارہ ۸، ۱۹۶۷ء)، "ہماری موسیقی" از قیصر قلندر اور "موسیقی کا ارتقا" از عرفان احمد (شمارہ ۶۲، ۲۰۱۳ء) مختلف شمارہ جات سے منتخب کردہ ہیں۔ یہ مضامین ارتقائے موسیقی کا احاطہ کرنے کے ساتھ موسیقی کی جمالیات اور تاثرِ جمالیات کو بھی محیط ہیں۔ مضمون نگاروں نے موسیقی کی تاریخ کو بیان کرتے ہوئے اس کے فنی تاثر اور جمالیاتی اثر آفرینی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ارتقائی مراحل قلم بند کیے ہیں۔ مذکورہ مضامین میں مرقوم تاریخ وارتقائے موسیقی کے مراحل ذیل میں درج ہیں۔

موسیقی کی ابتداء وارتقاء کے سلسلے میں ہمیں زمانہ قدیم کے اس دور کی طرف جانا پڑے گا جب اولاد آدم حیوانیت کی دہلیز پار کر کے مہذب انسان کے سفر کی طرف رواں دواں تھا۔یعنی کہ موسیقی کی کہانی انسانی خیالات اور سوچ کی ترقی کا نام ہے۔ موسیقی کا آغاز ترنم اور لے سے بھرپور گانے سے ہوا جب الفاظ سے ناواقف شخص خوبصورت آواز کو اکھٹا کرتے ہی ہاتھوں کی تال اور ڈھول کی اہمیت بھی ایجاد کی۔ اس طرح با قاعدہ طور پر انسانی ذہن کو آوازوں کی طرف مائل کیا گیا۔ اور یہاں سے موسیقی نے جنم لیا۔

موسیقی آواز و آہنگ کا حسین اور دلکش امتزاج ہے۔ فنکار اگر موسیقی کے زیر و زبر سے واقف ہو تو وہ متناسب، یکساں، دلکش اور متاثر کن نغمے وجود میں آسکتے ہیں جو سننے والے کو متاثر کر کے اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔ موسیقی کا حُسن اس کے متوازن زیر و بم اور مناسب ردھم میں پنہاں ہے، گویا گانے کا حسن برقرار رکھنے کے لیے متوازن سُر اور لے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ توازن فنِ موسیقی کی جمالیات کو فزوں کرتے ہوئے سامعین کے شعور و وجدان میں تحریک کا سبب بنتا ہے، جس سے وہ موسیقی میں مضمر معانی کی تفہیم کے قابل ہوتا ہے۔

وجدان کا تحرک اذہانِ سامعین میں فہم و ادراک کے نئے زاویوں کو وجود دیتا ہے، جس سے وہ تصوراتِ نو کی دریافت کر سکتے ہیں۔

موسیقی کے بنیادی عناصر درج ذیل ہیں:

۱: آواز

۲: سُر

۳: تال (توازن کے لیے)

۴: لے

۵: شاعری یا بول

موسیقی کا انحصار آواز اور اس کے توازن پر ہوتا ہے۔ اگر آواز اور سُر میں ترتیب و توازن نہ ہو گا تو وہ موسیقی کی بجائے شور کہلائے گا، شور چوں کہ بے ہنگم اور بے ترتیب آوازوں کا مجموعہ ہوتا ہے، اس لیے وہ جمالیات سے تہی ہوتا ہے۔ موسیقی کا حُسن ربط و ترتیبِ اصوات سے ہے۔ قیصر قلندر اپنے مضمون "ہماری موسیقی" میں موسیقی کے مذکورہ جمالیاتی پہلو کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

> "موسیقی، فطرت اور کائنات کی مثالی لے اور توازن ہے جو اپنے آپ کو فن کے ذریعے اس ارتقاء پذیر دنیا میں محسوس کراتے ہیں انسانی آواز سے سر اسی وقت حسین و جمیل نکلتے ہیں جب وہ ان کی وساطت سے شدید جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ جو ہماری ہمدردی ابھارتے ہیں"[۱۶]

موسیقی اظہارِ فن کا نام ہے جس میں آواز اپنے تراشیدہ اور بوجھل اجزاء سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لطیف اور تسکین بخش ہو جاتی ہے۔ فن قلبِ ماہیت کی صورت ہے مگر قلبِ ماہیت ہمیشہ تہذیبِ نفس پر انحصار کرتی ہے جیسے بے جان اور بے رونق شے میں سے چاشنی اور لطف کے پہلو نکل آتے ہیں در حقیقت آواز بے ہنگم اور سخت شے ہے جس میں کسی قسم کی جاذبیت کا عنصر نہیں پایا جاتا۔ آواز اس وقت موسیقی کے زمرے میں آتی ہے جب یہ فنکار کے جسم میں اپنی گرانباری سے نکل کر لطیف اور باعثِ تسکین ہو جاتی ہے۔

"لوری موسیقی ہے۔ رونا موسیقی کا ہی ایک حصہ ہے۔ نیند کے خراٹے میں بھی موسیقی ہے۔ پہاڑوں سے گرتے ہوئے پانی میں موسیقی۔ بارش کی رِم جھِم میں موسیقی۔ ہوا کی سرسراہٹ میں موسیقی۔ بادل کی گڑگڑاہٹ میں موسیقی۔ سوکھے پتّوں کی چرچراہٹ میں موسیقی۔ پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ میں موسیقی۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ میں موسیقی۔ ہونٹوں کی تھرتھراہٹ میں موسیقی۔ چوڑیوں کی کھنک میں موسیقی۔ پائل کی چھم چھم میں موسیقی۔ سمندر کی لہروں میں موسیقی۔ آنکھوں کی جھیل سی گہرائی میں موسیقی۔ کتابوں کے اوراق میں موسیقی۔ پنکھے کی رفتار میں موسیقی۔ جلتی آگ سے اُٹھتی چنگاریوں میں موسیقی۔ ٹرین کی چھک چھک میں موسیقی۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک میں موسیقی۔ ہوائی جہاز کی اُڑان میں موسیقی۔ پھولوں پر منڈلاتے بھنوروں کی گُنگناہٹ میں موسیقی۔ کمپیوٹر کے کی بورڈ پر رقص کرتی انگلیوں میں موسیقی۔ قلم کی صرصر میں موسیقی۔ کبوتر کی غٹرغوں میں موسیقی۔ کوئل کی کوک میں موسیقی۔ شیر کی دہاڑ میں موسیقی۔ سائل کی فریاد میں موسیقی۔ گھائل کی آہ میں موسیقی۔ حسن کی انگڑائی میں موسیقی۔ موسیقی کہاں نہیں ہے... ؟ یہاں تک کہ دو نفوس کے درمیان سانسوں کی بے ہنگم آمدورفت میں بھی موسیقی اپنا جلوہ دکھاتی ہے جس کے نتیجے میں افزائش نسل کا کاروبار پروان چڑھتا ہے۔ یعنی زندگی کے ہر رنگ میں موسیقی ہے۔ کائنات کے ذرّے ذرّے میں موسیقی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہماری زندگی بے لطف اور بے کیف ہو کر رہ جائے گی"[۱۷]

مسلمانوں نے برصغیر پاک و ہند فنی اور ثقافتی سطح پر دو تحفے دیئے ہیں۔ پہلا تحفہ اردو زبان جو کہ ہمارے لیے وقت کی اہم ضرورت تھی۔ دوسرا تحفہ تھا موسیقی کہ وہ سروہ جو برصغیر میں مسلمانوں کی آمدورفت اور اختراعاتِ فائقہ سے نکھر کے روح کو تسکین بخشتا رہا ہم نے ارادی یا غیر ارادی طور پر اس تحفے کی قدر نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ موسیقی اور مذہب کا تعلق تھا۔ تو دوسری طرف بہت سے ایسے لوگ جو موسیقی کو صرف سننے کی حد تک پسند کرتے تھے اور فن و ادب کے حقیقی تعلق سے نا آشنا تھے۔ جیسے راجا ویسے پرجا کے مصداق عوام و خواص سب ہی موسیقی کے طرفدار تھے مگر اس کے باوجود موسیقی کے زوال کا ایک سبب یہ ہوا کہ اپنی تمام تر لطافت

کے بوجود یہ شرفاء سے الگ تھلگ رہی۔ اور جس طبقے کی اس پر اجارہ داری تھی یا جس طبقے سے اسے مخصوص کیا گیا اسے ہم نے نادانی اور نسلی تفاخر کے مصنوعی انداز کی بناء پر اپنوں میں شمار نہیں کیا جس کے نتیجے میں فنِ موسیقی فنی اور روایتی بندشوں کا شکار ہو گئی۔ ہر گھرانے کی گائیکی نے اپنی انفرادیت کو مستحکم کرنے کے خیال سے اپنے سرمائے کو دوسروں تک منتقل نہیں ہونے دیا موسیقی کے زوال کی دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ موسیقی کی روایت کو باقاعدہ علم کا درجہ نہ مل سکا اسے قلمبند کرنے کے بعد سننے اور وقتی حظ اٹھانے تک محدود کر دیا گیا۔ مگر آج کے دور میں آہستہ آہستہ نہیں بلکہ بڑی تیزی سے یہ صورتِ حال تبدیل ہو گئی ہے۔ آج کی موسیقی سننے والے کلاسیکل موسیقی کے دور سے نا آشنا ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر فن اور فن کار اپنے سامع ناظر اور قاری سے ذہنی اور روحانی سطح پر تقسیم وذوق کا بجا طور پر مطالبہ کرتا ہے۔ اگر قاری، ناظر یا سامع اس کے فن کی لطافتوں سے ناواقف ہو تو وہ اس کے لیے باعثِ تسکیں کیسے بن سکتا ہے؟ کیونکہ فنون کا بنیادی مقصد ہمیں محظوظ کرنا ہے۔

شاعر اور موسیقی کا ربط بڑا گہرا ہے۔ شاعروں نے موسیقاروں اور موسیقاروں نے شاعروں کو ہدایت بخشی ہے یہی وجہ ہے کی فن و ادب کو ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم قرار دیا جاتا ہے۔ موسیقی کو روح کی غذا کہا جاتا ہے۔ ایک موسیقار سُر کے ذریعے اپنے جذبات اور احساسِ جمال کا اظہار کرتا ہے۔ جذبات اور جمالیات کا یہ اظہار سامعین کے احساسات کو برانگیخت کرنے کے ساتھ ان کے حسِ جمال کی تسکین و تقویت کا باعث بھی بنتا ہے، پس فنِ موسیقی اظہارِ جذبہ کے ساتھ اظہارِ جمال کا کام بھی بہ درجہِ اتم نبھاتی ہے، موسیقی کے اس جمالیاتی تناظر کو ڈاکٹر وگنر اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

> " موسیقی کسی خاص شخص کے ان جذبات کے اظہار کا نام نہیں جو کسی خاص شخص کے جذبات کا ایسا اظہار ہے جو ہر صورت اختیار کرنے پر قادر ہے۔ "[۱۸]

۲۔ موسیقی کی روایت کے مضامین:

موسیقی کی ایجاد پر مؤرخین اختلاف کا اظہار کرتے ہیں۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ موسیقی حکیموں کے آلات کے بجنے سے ایجاد کی۔ کچھ کا خیال ہے کہ پرندوں کی خوبصورت آواز اور دلکش مناظر نے موسیقی کو جنم دیا۔ پرندوں کی چونچ سے نکلنے والی آوازیں موسیقی کے آغاز کا سبب ہیں۔ جمہور مؤرخین اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ موسیقی فیثا غورث کی ایجاد ہے۔ ڈاکٹر جواز علی سہ ماہی "سیپ" کے پچھترویں شمارے میں

مضمون "موسیقی کی ایجاد" میں ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ خواب میں فیثا غورث کو موسیقی کی ترغیب دی جاتی تھی۔

"اٹھ دریا کے فلاں ساحل پر جا اور وہاں سے ایک عجیب علم حاصل کر فیثا غورث تین دن برابر اس ساحل پر جاتا رہا لیکن اسے وہاں سے کچھ دستیاب نہ ہوا۔ تیسرے دن جب وہ مایو س ہو کر واپس آرہا تھا تو اس نے ساحل پر چند لوہاروں کو متناسب طریق سے ہتھوڑوں سے چو ٹیں لگاتے ہوئے دیکھا۔ حکیم موصوف نے ان آوازوں پر غور کیا اور ان میں متعدد اقسام کے تناسبات معلوم کیے اور پھر ان متناسب آوازوں کے مطابق آلہ بنادیا۔"[۱۹]

مذکورہ روایت موسیقی کے بنیادی خصائص کو اجاگر کرتے ہوئے، اس فن کے حُسن کے اسباب کو بیان کرتی ہے۔ "متناسب طریق سے ہتھوڑوں پر چوٹیں لگانا"، "متعدد اقسام کے تناسبات" اور "متناسب آوازوں کے مطابق آلہ" بنانا، جملے کے نشان زدہ حصص میں فنِ موسیقی میں جمالیات کا باعث بننے والے بنیادی پہلوؤں کا اظہار ہوتا ہے۔ "متناسب اور تناسبات" الفاظ اس بات کا مظہر ہیں کہ موسیقار ادائیگی اصوات کے تناسب اور آواز کے مناسب زیر و بم سے سُر اور لے کی ترتیب بناتا ہے، اصوات کا مناسب ربط اور ادائیگیِ اصوات کی موزوں ترتیب سامعین اور موسیقار کی جمالیات کو آسودگی پہنچاتے ہوئے افکارِ نو کی جانب متحرک کرتی ہے؛ یہی موسیقی کے فن کی حسِ جمال کہی جاسکتی ہے۔

ابتدائے موسیقی کے ضمن میں بعض مؤرخین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ موسیقی کی ایجاد حضرت داؤد کے دور میں ہوئی یہی وجہ ہے کہ ان کی خوبصورت آواز اور خوش الحانی کی مثال دی جاتی ہے۔ مرزا سلطان احمد مضمون "فنونِ لطیفہ" میں کتابِ زبور میں مرقوم ارشاد کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس نے (خدا نے) میرے منہ ایک گیت ڈالا۔ جس سے ہمارے خدا کی حمد ہوئی۔"[۲۰]

اوپر بیان کی گئی روایات کسی حد تک درست بھی ہیں مگر یہ تمام کے تمام اعتقادی روایات ہیں۔ تمام لوگ نہ تو اس سے اختلاف کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے حامی ہیں۔ مؤرخین بھی اس تناظر میں دو دھڑوں میں بٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں یہ کہنا کی موسیقی فردِ واحد کی ایجاد ہے۔ بالکل درست نہ ہو گا بلکہ موسیقی کا بنیادی موزوں آواز ہے۔ اور آواز ہر دائرے اور ہر خطے میں متکیف ہے اور آواز کا انسان کو متاثر کرنا بھی ایک فطری

عمل ہے۔لہذا یہاں یہ کہنا کہ فلاں شخص یا قوم نے راگ ایجاد کیا ہے۔درست نہ ہو گا بلکہ موسیقی یا راگ ایک فطری جذبہ ہے۔اور جذبات کی ایجاد کبھی ایک شخص کی نہیں ہو سکتی۔نہ کسی جذبات کو کبھی پابندی میں کیا جا سکتا ہے۔بلکہ یہ مختلف قوموں اور رنگوں میں ایجاد ہوا۔اور مختلف قوموں اور رنگوں سے اسے شہرت ملی۔البتہ بعض اقوام کو اس ضمن میں خاص اہمیت و شہرت ملی۔اس فن میں ایرانی، شامی اور یونانی شامل ہیں۔اب سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ موسیقی کیا ہے اور علم سے اس کا کیا تعلق ہے؟کیا علمی رنگ سے اسے کوئی خاص نسبت ہے یا کہ نہیں؟آغاز میں موسیقی کو علمی رنگ نہیں دیا جاتا تھا۔بلکہ یہ فن صرف چند ہاتھوں میں رہ گیا تھا۔احمد علی مضمون "علمی رنگ میں موسیقی" میں موسیقی کے علمی پہلو کے متعلق رقم طراز ہیں:

> "ہندوستان اور دیگر حصص ایشیاء میں رفتہ رفتہ یہ فن ان لوگوں کی گود میں پرورش پانے لگا جس میں سے بہت کم علمی ذوقِ مذاق رکھتے تھے۔جب کوئی فن اور کمال خاص لوگوں میں محدود ہو جائے تو اس کی وقعت عامہ میں فرق آنے لگتا ہے۔ایشیا اور ہندوستان کی سرزمین میں رفتہ رفتہ راگ بھانڈیوں، مراثیوں وغیرہ وغیرہ کے قابو میں آچکا تھا۔یہاں تک کہ اسے ایک حد تک شرافت کی بعید سمجھا گیا۔"[۲۱]

کوئی گیت، نغمہ یا ترانہ سبھی راگ کے معنوں میں ہی ہیں۔پس نغمہ کا معانی خوش آواز کے ہیں۔ایسی آواز جو وجود کے لیے باعثِ سکون ہو۔جس کو سننے سے انسان کو خوشی اور راحت محسوس ہو وہ موسیقی یا راگ ہے، کسی شے سے بہ ذریعہ حواسِ خمسہ براہ راست لُطف اندوز ہونا تحریکِ جمالیات کا اولین پہلو ہے۔بزرگوں اور صوفیاء کی بارگاہوں میں راگ اسی حساب سے ترتیب پاتا ہے کہ وہ ترتیب دل و دماغ کے لیے باعثِ راحت ہوتی ہے۔یعنی مختصر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ گانے کے معنی وہ خوبصورت اور دلکش آوازیں نکالنا ہے جو ضابطہ راگ سے واقفیت اور سننے میں باعثِ فرحت وانبساط ہوں۔سننے کے ذریعے حاصل شدہ یہ ابتدائی احساسِ فرحت سامعین کو بہ تدریج وجدانی حظ کی جانب مائل کرتا ہے اور بعد ازاں وجدانی حظ کا نکتہِ کمال سامع کی فطری صلاحیت کے مطابق اسے حیات و کائنات یا کم سے کم موسیقی کے اسرار کے نئے تصورات تک پہنچنے میں معاونت کرتا ہے۔

۳۔ شخصیتِ موسیقار پر مضامین:

تمام انسانی جذبات و احساسات میں خوشی و مسرت ہی ایک ایسا اچھا اور منفرد جذبہ ہے جو کہ انسان کے حواسِ خمسہ سے خاص تعلق رکھتا ہے۔ اور اس سے انسان کے تمام جذبات و احساسات وابستہ ہوتے ہیں ۔انسان فطرتاً اس بات کی تلاش میں رہتا ہے کہ یہ ہر کام، ہر حرکت پر خوشی اور طمانیت کی گود میں پرورش یافتہ ہو۔ فطرتاً اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے تمام احساسات و جذبات کو اپنے قابو میں کر لے۔ اور زندگی کے آغاز سے انجام تک خوشیوں سے بھری ہوئی ہو۔ ایک طالبعلم اپنے انداز سے پر مسرت زندگی گزارنا چاہتا ہے تو ایک مؤرخ اپنے انداز میں۔ اس طرح ایک مذہبی شخص کہ اپنی منفرد سوچ ہے۔ ایک موسیقار کی خوشی اس کی دھنوں سے جڑی ہوتی ہے۔ وہ دھنیں کس انداز میں ترتیب دیتا ہے اور یہ ترتیب کس طرح اس کے لیے شادمانی کا باعث بنتی ہے؟ شادمانی کی اس کیفیت کے ساتھ موسیقار اپنے فطری جمالیاتی پہلو کے تحت سُروں کی ترتیب اور سنگیت کی تنظیم کرتا ہے۔ آہنگِ موسیقی کی یہی ترتیب و تنظیم موسیقار اور سامعین کو احساسِ لطیف سے سرشار کرتی ہے۔ اصوات کے ردھم اور ادائیگیِ سُر کے زیر و بم سامعین کی حسِ جمال کو برانگیحنت کرتے ہیں۔ سامعین اور خود موسیقار بھی حسِ سماعت کے توسط سے ترنم کی شائستگی اور ربط کو محسوس کرتے ہوئے لطف کشید کرتا ہے، اپنی استعداد کے مطابق یہ لُطف اس کے وجدان کو متحرک کرتے ہوئے ردھم اور لے کے پس پردہ معانی سے روشناس کراتا ہے، وجدانی تحرک کے اس عملِ لطیف کے تحت وہ اپنے لاشعور میں مضمر احساساتِ نو تک رسائی حاصل کر کے ان سے مسرت کشید کرتا ہے۔ اس طرح تحریکِ جمالیات کے تمام اسباب و اشکال تدریجاً سامعین اور قاری کو فن کی اسرار و رموز سے آگہی دیتے ہوئے خود آگہی کی جانب مائل کرتے ہیں۔

فنونِ لطیفہ جس کا انسانی نفسیات سے بہت گہرا تعلق ہے۔ فن انسان کے جذبات و احساسات کو جِلا بخشتا ہے جس کا تجزیہ انسانی ذہن میں ہوتا ہے۔ مصوری، مجسمہ سازی، خوش نویسی اور موسیقی وغیرہ یہ سب فنون اپنی اپنی جگہ اثر انگیز ہیں لیکن فنِ موسیقی کی لطافت اور معنویت کی اہمیت اپنی جگہ منفرد ہے۔ انسانی دل و دماغ پر اثر کر کے داخلی کیفیات میں تبدیلیاں برپا کرنا صرف فن موسیقی ہی کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کے ہر دور میں فنون لطیفہ کی اہمیت مسلم رہی ہے اور ہر سطح پر اس کی ترویج و ترقی ہوتی رہی۔ ویسے تو اس فنِ لطیف کی حیثیت مثلِ بحرِ بیکراں کی سی ہے اور اس کی لامحدودیت بھی اس کا ایک امتیازی وصف ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا غوطہ زن اس کی تہوں تک نہیں پہنچ پاتا۔ زیرِ نظر تحریر ایک

ادیب و فنکار کے اُن مضامین کا مختصر سا جائزہ ہے جو موصوف نے فنِ موسیقی پر تحریر کیے اور جن کی طباعت لوک ورثہ کی وساطت سے مضامینِ موسیقی کے نام سے ہو چکی ہے جس میں اس فنکار کی فن موسیقی سے جُڑی ہوئی صلاحیتوں کا عرفان ہوتا ہے۔

> "فنِ موسیقی ایک مکمل طور پر عملی فن ہے اس کا دائرہ کار صرف سروں تک محدود نہیں یہ فن اپنے اندر ایک مکمل دبستان کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے کئی شعبے ہیں اور ہر شعبہ علمی و فنی لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے اور فنکار کے لئے ضروری ہے کہ وہ موسیقی کے تمام شعبوں سے بخوبی واقف ہو تا کہ وہ نہ صرف اپنے فن کی بہتر طریقے سے ترویج کر سکے بلکہ فن کو مکمل اثر انگیز بنا سکے۔ اس حوالے سے علم موسیقی میں تین شعبے بڑی اہمیت رکھتے ہیں جن میں سر، لے اور تال شامل ہیں۔ موسیقی صرف سروں کا نام نہیں بلکہ لے ،تال اور راگوں کو مکمل طور پر سمجھ کر گانا ہی اصل موسیقی ہے "۲۲

برصغیر پاک و ہند میں ایسے بڑے بڑے موسیقار پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی ساری زندگی ایسی خوبصورت دھنوں اور راگوں کو ترتیب دینے میں گزار دی۔ ان میں ایک نام نثار بزمی کا ہے۔ موسیقی اور اس کے لوازمات پر جتنا عبور آپ کو حاصل تھا وہ شاید ہی کسی اور کے حصے میں آیا ہو۔ آپ نے ایسی منفرد اور دلکش موسیقی ترتیب دی کہ باذوق افراد اس سے لطف اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ۱۹۴۴ میں آپ نے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا اور ممبئی کے ایک ڈرامے "نادر شاہ درانی" کی دھنیں ترتیب دیں اور یہ دھنیں آپ کو شہرت کی بلندیوں تک لے گئیں۔

" فلم ہیڈ کانسٹیبل" کے بعد فلم انڈسٹری کے دروازے نثار بزمی پر کھل گئے۔ ان کی موسیقی کی ترتیب سے ہر شخص پر یہ باور ہو گیا کہ ہر شخص تفریحاً موسیقی سے وابستہ نہیں بلکہ ایک واضح مقصد کے ساتھ یہاں قیام کیے ہوئے ہے۔ علی جعفری اپنے مضمون "موسیقی اور موسیقار" میں اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "ان کی دھنوں کی ترتیب میں سوز بھی ہے اور درد بھی۔ کبھی غم کی کیفیت کو اتنے دلکش انداز میں ترتیب دیتے ہیں کہ سننے والا اس کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ تو کبھی ایسی خوشی اور سرور کی گیت بناتے ہیں جو ہر انسان کے لیے باعث راحت ہوتے ہیں۔ جو کہ باذوق افراد کو باہم سرور پہنچانے کے ساتھ ساتھ بد ذوق افراد کے دلوں کے تار بھی چھیڑ جاتے ہیں۔

یہ ان کے فن کے جمالیاتی حُسن کی یہ دولت ہے کہ وہ اپنی دُھن میں ردھم اور آہنگ سے ایسی کشش تخلیق کرتے ہیں کہ سامعین احساسِ لُطف کے لیے اس کی سماعت کے لیے راغب ہوتے ہیں اور یہ کشش لاشعوری طور پر انھیں وجدانی ادراک اور خود آگہی کے مراحل کی طرف لے جاتی ہے۔"[۲۳]

کوئی شخص بھی پیدائشی موسیقی دان نہیں ہوتا۔ شاعر پیدائشی ہو سکتا ہے لیکن موسیقی کار پہلے راگ سیکھتا ہے جو کہ ایک خاص اصول وضوابط کے مطابق لکھا جاتا ہے۔ برصغیر پاک وہند میں موسیقی کا ایک اور بڑا نام نوشاد علی کا بھی ہے۔ ۱۹۱۹ میں بھارتی شہر لکھنؤ میں پیدا ہونے والے نوشاد نے ۱۹۳۷ میں فلم انڈسٹری میں قدم رکھا۔ علی جعفری اپنے مضمون "موسیقی اور موسیقار" میں اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"نوشاد ہمیشہ اپنے فن میں تجربات کرنے کے حوالے سے مشہور تھے۔ انہوں نے کلاسیکی موسیقی اور لوک گیت کو لوگوں کے سامنے رکھا۔۔۔۔ نوشاد نے ۶۷ فلموں میں موسیقی کا جادو جگایا۔"[۲۴]

نوشاد کو موسیقارِ اعظم کا خطاب دیا گیا۔ انہوں نے اتنی حسین اور دلکش دھنیں ترتیب دیں جو کہ سننے والے پر سحر کی کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔ اور وہ اس سحر میں کھو کر زندگی کی رنج و غم کو کچھ دیر کے لیے بھلا دیتا ہے۔ یہ خوبصورت دھنیں انسانی جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سبب بنتی ہیں۔ اور انسان کو وقتی طور پر دنیاوی خوشی اور غم کی کیفیات سے دور ایک الگ دنیا کی سیر کرواتی ہیں۔

ایک اچھے فنکار کو سماج کے اجتماعی شعور اور لاشعور میں موجود سکون واطمینان اور بے چینی وبے قراری کا ادراک عام آدمی کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ سماج کے مختلف عناصر کے قبیح اور حسین پہلوؤں سے بہت اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ وہ اپنے جمالیاتی ذوق کی آبیاری کے لئے عام انسان سے قدرے زیادہ متجسس اور متحیر رہتا ہے۔ اور اس طرح وہ ایک عام انسان ہونے کے باوجود بھی پورے سماج کے اجتماعی شعور کا نمائندہ ہوتا ہے۔ آج کا کوئی بھی آرٹسٹ جدید دنیا میں ہونے والے واقعات سے لاتعلق رہ کر محض جام و سبو، گل و بلبل اور دیگر دلفریب مناظر کی خوبصورتی سے دل نہیں بہلا سکتا۔ نوشاد کا شمار بھی ایسے نایاب موسیقاروں میں ہوتا ہے۔

کلاسیکی موسیقی کو موسیقی میں سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ استاد حامد علی کا شمار برصغیر پاک وہند نے نامور موسیقاروں میں ہوتا ہے۔ آپ کا تعلق موسیقی کے پٹیالہ گھرانے سے تھا۔ آپ کے والد اختر علی خان اپنے وقت کے نامور گلوکار تھے۔ آپ نے موسیقی کو اس انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کیا کہ سننے والا اس سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ کلاسیکی انداز میں پہلوئے جمال سے مزین ترنم اور سوز کا دلفریب جادو سننے والوں کے کانوں میں رس گھول دیتا تھا۔ اور وہ کئی کئی دن اس سحر کی کیفیت سے باہر نہیں نکل پاتے تھے، موسیقی کا جمالیاتی پہلو اس سحر انگیزی کا باعثِ بیّن تھا، نیز موسیقی کی جمالیات سحر انگیزی کے ساتھ انسان کے وجدان کے تحرک کا باعث بھی بنتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ برصغیر پاک وہند میں موسیقی کے گھرانوں کی وجہ سے یہ فن ابھی تک پھل پھول رہا ہے۔ کیونکہ مذہبی تعصب پسندی اور فرقہ واریت نے اس فن کو بری طرح متاثر کیا۔ مگر اس کے باجود موسیقی کے یہ گھرانے نسل در نسل اس فن کے فروغ میں کوشاں دکھائی دیتے ہیں۔ جواز جعفری "کلاسیکی گھرانوں میں موسیقی" مضمون میں اپنی تحقیق کے مطابق موسیقی کے ضمن میں کلاسیک اور مقلد کی توضیح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "برصغیر پاک وہند میں کلاسیکی موسیقی میں گھرانوں کا تصور قدامت سے زیادہ فقہی طرز پر قائم ہوا۔ فقہ میں اجتہاد کا تصور یہ ہے کہ اگر کوئی دینی سکالر اگر کسی مجتہد کی فقہی تشریح قبول کرلیتا ہے تو وہ ہمیشہ مقلد ہی رہے گا۔ اور اگر وہ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق کوئی راستہ نکالتا ہے تو ایسی صورت میں وہ خود مجتہد کے درجے پر فائز ہو سکتا ہے، موسیقی گھرانے بھی اسی ترتیب پر وجود میں آئے جن میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔"۲۵

ان گھرانوں نے نسل در نسل ایسے عظیم گائیک تخلیق کیے جو کہ آنے والی نسلوں میں اس فن کو زندہ رکھنے کا ذریعہ بنے اور امید ہے کہ آنے والی نسلوں میں یہ عظیم فن کار اس فن کی ترویج کرتے رہیں گے۔ مگر وقت کے ساتھ ان گھرانوں کی اہمیت اس بات کی گواہ ہے کہ جب کسی ثقافتی ورثے کے بوجھ کو فنکاروں کی اگلی نسل اٹھانے سے منع کر دے تو اس فن کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ گھرانے پچھلی کئی دہائیوں سے موسیقی کے فن کی پھلنے پھولنے کا اہم ذریعہ بنے رہے ہیں۔ اور یہ سلسلہ مستقبل میں بھی اس فن کی آبیاری کا باعث بنے گا۔

ج۔ خطاطی:

فن ایک عظیم نعمت ہے۔ جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ فن کی تخلیق کے لیے انسان کو انسانیت کی معراج سے بھی آگے کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ وہ بشری سطح سے بلند ہو کر ماورائیت و لا انتہائیت کی وادیوں میں کھو کر عظیم شاہکار تخلیق کرتا ہے۔ فنکار اکثر فن پارے کی تخلیق کے دوران عرفان و وجدان کی دنیا میں گم ہو جاتا ہے۔ اور دنیا سے ہر تعلق و رابطہ ختم کر کے روحانی دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اس دم بخودی کی کیفیت اس کی چشم باطن اسے کرشمہ سازی کی راہ دکھاتی ہے جس پر چل کر وہ دنیائے فن کے نایاب گوہر تخلیق کرتا ہے۔ یہ تخلیقات کبھی اسے مصور، کبھی خطاط کبھی سنگ تراش اور کبھی شاعر بنا دیتی ہیں۔

متذکرہ فن کے ضمن میں سہ ماہی "سیپ" میں مختلف مضامین شائع ہوئے ہیں، تجزیے کے لیے منتخب مضامین میں، مختلف شمارہ جات سے لیے گئے یہ مضامین شامل ہیں: "مخزن خطاطی" از خورشید عالم گوہر، "صادقین" از پروین (شمارہ ۷۸)، "فنِ خطاطی کی تاریخ" از وقار احمد (شمارہ ۴، ۱۹۶۶ء)، "فنِ خطاطی کا انسان سے تعلق" از میمونہ انصاری (شمارہ ۷، ۱۹۶۷ء)، "عہدِ مغلیہ میں خطاطی کا فن" از نسیم درانی (شمارہ ۹، ۱۹۶۹ء)۔

ا۔ خطاطی کی روایت کے مضامین:

انسان کب دنیا میں آیا؟ زمین پر آنے کے بعد اس کے مشاغل کیا تھے؟ لوح و قلم کی جانب کب متوجہ ہوا؟ اس کے متعلق کچھ بھی حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن انسانی تہذیب کے سات ہزار سال کے قدیم ارتقائی ادوار پر تحقیق کی گئی اور اب یہ سلسلہ تین لاکھ سال تک جا پہنچا ہے۔ اس دنیاوی مخلوقات میں عقل کی دولت سے مالا مال اور سکھ و دکھ کی عملی تصاویر، تہذیبوں اور کہانیوں کا عنوان ہے۔ دھرتی ماں نے اپنے سینے میں لاتعداد شہروں، بے شمار تہذیبوں اور ان گنت مخلوقات کو چھپا رکھا ہے۔ اس مٹی سے جنم لے کر بشر نے آسمان کو ان گنت منظر دکھائے اور بالآخر فنا کے مسلسل حرکت کرتے ہاتھوں نے ان مناظر کو ایسے مٹا دیا ہے جیسے تختی پر حروف لکھنے کے بعد اسے دھو کر مٹا دیا جائے۔ انسانی تہذیب و تمدن اور اس کے اتار چڑھاؤ کے بارے میں ماہرین کی آراء مختلف ہیں۔ ہر قوم کے مذہبی عقائد، تہذیب، رسم و رواج، حالات و واقعات ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ مگر دنیا میں انسان کا وجود ایک حقیقت ہے۔ ماہرین انسان کی تہذیب کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ طوفانِ

نوح سے پہلے کی تہذیب اور طوفانِ نوح کے بعد کی تہذیب۔ ان دونوں تہذیبوں کا ذکر تمام قدیم مذاہب کی کتب میں موجود ہے۔

جیسے جیسے انسان تہذیب و تمدن کی دنیا میں آتا گیا جہاں اس نے دوسرے تمام شعبوں میں ترقی کی وہیں اس تہذیبی بھاگ دوڑ میں لوح و قلم بھی ساتھ ساتھ رہے۔ آغاز میں پتھر کی تختیوں پر کھود کر لکھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ روشنائی کی مدد سے پتوں اور جانوروں کی کھالوں کو خشک کر کے ان کے اوپر بھی لکھا جاتا تھا۔ تصویری خطوط کے ذریعے بھی پیغام پہنچائے جاتے تھے۔ پتھر کے دور کے بعد حالیہ تحریری دور کا آغاز تقریباً چھ ہزار سال قبل عراق کے شہر ایرک کی ایک عبادت گاہ سے ہوا۔ بعد ازاں یہ سلسلہ چلتا گیا کبھی خطوط تو کبھی تصویری نمو نوں کی صورت میں اس فن نے ترقی کی۔

مسلمانوں میں عباسی اور مغلیہ دورِ خطاطی کو خاص اہمیت دی گئی۔ اس عہد کے سلاطین نے خطاطوں کو بے پناہ عزت اور فن کے فروغ کے لیے مالی معاونت فراہم کی۔ انہیں بے شمار مراعات دیں تا کہ وہ دل جوئی کے ساتھ کام کریں۔ اور اس فن کی آبیاری کر سکیں۔ اپنی مراعات کے زیرِ اثر فنکاروں نے بہت دل جمعی سے کام کیا۔ جو کہ اس فن کے پھلنے پھولنے کی اہم وجہ بنا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری الہامی کتاب کی پہلی وحی میں "اقراء" کے بعد "علم بالقلم" کتاب و قلم کے ذریعے علم حاصل کرنے کا حکم دیا۔ خطاطی کو "ام الفنون" بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں دیگر فنون مثلاً نقاشی، مصوری کی تمام جیومیٹریکل اشکال موجود ہیں۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تمام خوبیاں جو باقی فنون میں انفرادی طو رپر موجود ہیں وہ تمام خطاطی میں موجود ہیں۔ خطاطی کے متعلق ایک مقولہ مشہور ہے کہ خطاطی کرتے وقت خطاط کائنات کے تمام حصوں کی سیر کرتا ہے۔ اسلام میں قلم کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں کہیں اس قلم سے علم سیکھنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو کہیں قلم کی قسم کھائی جا رہی ہے۔

﴿الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾[۲۶]

"اس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا"

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ﴾[۲۷]

"ن" قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔"

خطاطی ایک نور ہے اور اس کی روشنی اور جگمگاتی کرنیں باطن کو منور کر دیتی ہیں۔ خطاطی باعثِ رزق فن ہے اس کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے

"**الخط مفاتیع الرزق**" (خطاطی رزق کی چابی ہے۔)[۲۸]

خطاطی کا دائرہ کار وسعت کے لحاظ سے پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ مگر اسلام میں اس فن کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہوا وہ کسی اور فن کے نصیب میں نہ آیا۔ مسلمانوں کی خطاطی نے دوسرے مذاہب کے افراد کو بھی متاثر ہو گیا۔ مثلاً عیسائیوں نے مسلمانوں سے متاثر ہو کر اپنے گرجاگھروں میں خطاطی کرنا شروع کر دی۔ دنیائے فن میں مقام و مرتبہ خطاطی کو حاصل ہوا وہ کسی اور کے حصے میں نہ آیا۔ ڈاکٹر مارٹن لنگز نے ایک مشہور تصنیف "دی قرآنک آرٹ" میں تحریر کیا ہے:

"اسلامک ورلڈ نے دنیا کو بہت خوبصورت تحفہ دیا وہ قرآنی خطاطی تھی۔ اور بلاشبہ خطاطی ایک پاکیزہ فن ہے۔"۲۹

"خوب صورت تحفہ" کے الفاظ خطاطی کے جمالیاتی پہلو کے عکاس ہیں۔ تحفہ اسی صورت قلب و نظر کو بھا سکتا ہے جب وہ جمالیات کو تحریک دینے کے کم از کم پہلے احساس سے میل کھائے۔ تحریکِ جمالیات کا احساسِ اول یہ ہے کہ کسی شے کو براہ راست دیکھ کر حواسِ خمسہ کے توسط سے مذکورہ شے سے حظ اٹھانا۔ فنِ خطاطی کے ضمن میں یہ حظ حسِ بصارت کے ذریعے ممکن ہے۔ الفاظ کو خوب صورتی سے لکھنا اولین احساسِ جمال کی تحریک کا سبب ہے۔ ہر انسان کے لیے معیارِ حُسن الگ ہے، خطاط اپنے جمالیاتی معیار کے مطابق الفاظ لکھتا ہے، خطاط کے تحریر کردہ الفاظ کا انداز ہر ناظر کی توجہ حاصل کرے یا ہر دیکھنے والے کے معیارِ جمال پر پورا اترے، ضروری نہیں۔ تاہم، یہ مسلّم ہے کہ خطاطی اپنے فن کار کے معیارِ جمال کی عکاس ہوتی ہے۔ لکھے ہوئے الفاظ کی خوب صورت اور توجہ گیر بناوٹ ہی جمالیاتی اظہار و تحرک کے لیے کافی نہیں، بلکہ یہ ابتدائی تحریک ہے؛ اگر الفاظ بے ربط اور بے معانی ہوں گے تو جمالیات کی ابتدائی تحریک کی اثر انگیزی تا دیر قائم نہیں رہے گی، حُسنِ ظاہری الفاظ یا عبارت کی بے ترتیبی اور بے معنویت میں الجھ کو معدوم ہو جائے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ الفاظ لکھت کے ظاہری حُسن کے ساتھ پڑھت کے معنوی جمال سے بھی مرصع ہوں۔ الفاظ و معانی کے تعلق میں بھی خطاط اپنے جمالیاتی

معیار سے حُسن و کشش پیدا کرتا ہے، احساسِ اول سے متاثر ناظر جلد لفظ و معنی کے پس پردہ جمال و فہم سے وجدانی حظ کشید کرتا ہے، بر عکسِ ازیں وہ ناظر جس کا معیارِ جمال خطاط کے جمالیاتی معیار سے مختلف ہوتا ہے، غور و فکر کے عمل سے گُزر کر الفاظ کے پس پردہ جہانِ معانی اور لفظ و معنی کے تعلق سے ابھرنے والے جمالیاتی شعور تک پہنچتا ہے، ممکن ہے کہ یہاں وجدانی مسرت کیشی سے اس کی جمالیاتی حِس تسکین پائے۔ وجدانی لُطف ناظرین کو اپنے ذہنی و فکری ذوق اور علمی شوق کے مطابق تصورات و تخیلاتِ نو کی جانب مائل کرتا ہے۔

اسلامی تہذیب کی جمالیاتی روح دو فنون میں بذریعہ اتم ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی خطاطی اور فنِ تعمیر! قرآنِ کریم کی اوّلین تنزیل میں نبی اکرم ﷺ کو اس رب کے نام سے پڑھنے کا حکم دیا گیا جس نے قلم کے ذریعے پڑھایا۔ یا علم دیا۔ گویا قلم "یعنی" آلہ تحریر و کتابت کو اسلام کے نظامِ علامات میں بے حد گہری اور رمزیاتی معنویت حاصل ہے اس لئے دنیا کے تحریری فنون میں مسلمانوں کی خدمات غیر معمولی اور نوعِ بشر کی وراثتِ خط میں مسلمانوں کے اضافے بے شمار اور بے پایاں ہیں۔ اسلام نے صورت گری اور نقش آرائی کے فن کو چنداں حوصلہ افزائی کی نظر سے نہیں دیکھا تاکہ دنیا سے بُت گری اور بُت پرستی کی رسمِ قبیح سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکے چنانچہ مسلمانوں کا جذبہ نقش آرائی تمام تر حُسنِ خط میں مرتکز ہو گیا یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ آج ہم جس چیز کو اسلامی خطاطی کی روایت کہتے ہیں وہ ان تمام علوم سے عبارت ہے جن کی اساس عربی حروفِ ابجد اور عربی کے ابتدائی رسم الخط پر رکھی گئی۔ زمانہ جاہلیت میں جو بصری فنون رائج تھے وہ غیر اسلامی تھے۔ اسلام کی تعلیمات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے قرآنی لفظوں کو حُسنِ تحریر کے ساتھ رقم کرنے کا اور اپنی جمالیات سے عربی علوم و فنون کو تخلیق میں ڈھالنے کا رواج دیا گیا۔

اسلام میں خطاطی کو نہ صرف بلند و مقام و مرتبہ حاصل ہے بلکہ اس فن نے معاشرتی اصلاح میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ فنکاری کی یہ صنف ثقافت اور معاشرے کے تمام فنون پر اثر انداز ہوئی۔ الہامی کتب کے ساتھ ساتھ دیگر کتب جیسے کہ سائنس، ادب اور مذہب سے متعلق کاموں کی عمدہ انداز میں خطاطی کی گئی۔ مسجد، منبروں، دیواروں، تلواروں اور مختلف آلات کو خطاطی کے فن سے آراستہ کیا گیا میمونہ انصاری مضمون "فن خطاطی اور آج کا انسان" میں اپنی تحقیق کے مطابق خطاطی کے ضمن میں کلاسیک اور مقلد کی توضیح ان الفاظ میں کرتی ہیں:

"فن خطاطی اپنی تمام کمال جمالیاتی شان وصفا، تخلیقی جلوہ نمائیوں اور تسخیری عظمتوں کے ساتھ جملہ فنونِ لطیفہ میں ممتاز و منفرد ہے۔ یہ خطاطی عالم اسلام کا ایک لازوال شاہکار ہے اور مصور فطرت کی خاص دین ہے جس سے صرف سی پارۂ دل کی عظمت قائم ہے بلکہ کائنات کی رعنائی وزیبائی بھی اسی سے دائم و قائم ہے۔ یہ فن لوح دل کو جلا بخشنے والا، انسانی عظمت فکر کو چار چاند لگانے والا اور مسکوکات مخطوطات کو زیب و زینت دینے والا یہی ایک ایسا فن ہے جس کے آگے شہنشاہ سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ شہزادوں اور شہزادیوں کے نو لکھے ہار نثار ہوتے ہیں۔ مصور اپنی قلمونیاں بھول جاتا ہے۔ یہاں تک کہ محبوب کجکلاہ بھی اپنا دل نکال کر رکھ دیتا ہے۔ یہی خط یہی دائرے اور نوک و پلک خود انسان کے کتابی چہرے کو بھی صحیفہ بنا دیتے ہیں۔ اگر بہ نظر غائر دیکھیں تو انسان کا چہرہ خود ایک شاندار خطاطی کا نمونہ ہے "۳۰

خطاطی، بحیثیت اسلامی فن، کافی سراہی گئی۔ مذہب اسلام کے ماننے والے دنیا کے مختلف ممالک میں ہیں، اور مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ یہ فن، مسلمانوں کی مختلف زبانوں کو جوڑنے کا کام کیا ہے۔ عربی، فارسی، اردو، سندھی، آذیری، ترکی وغیرہ زبانوں میں بھی یہ فن مقبول ہوا۔ قرآن کی کتابت میں یہ فن بہت ہی کار آمد رہا۔ چھاپہ مشین ایجاد ہونے سے پہلے، کاتب حضرات ہی ان زبانوں میں کتابت اور اشاعتوں کا بیڑا اٹھایا۔ عثمانیہ دور میں 'دیوانی' خط عروج میں آیا۔ دیوانی خط کا ایک روپ 'جلی دیوانی' یا 'دیوانی الجالی' ہے۔ رفتہ رفتہ، 'رقع' خط کا ارتقاء ہوا۔ جو کہ آج تک مسلمان خطاطوں میں مقبول ہے۔

۲: شخصیتِ خطاط کے مضامین:

خطاطی کے فن کو دنیا کے سامنے متعارف کروانے والوں میں نہ صرف مرد فنکار شامل تھے بلکہ اس میں خواتین نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ انسان بہ طور مجموع حُسن پسند ہے، لہٰذا خطاط کی حُسن پسند طبیعت اس کی شخصیت اور فن دونوں میں منعکس ہوتی ہے۔ میمونہ انصاری کا مضمون "فنِ خطاطی کا انسان سے تعلق" سہ ماہی "سیپ" کے شمارہ ۷ (۱۹۶۷ء) میں شائع ہونے والا اہم مضمون ہے، جس میں خطاط کی شخصیت اور حسنِ جمال کے خطاطی میں اظہار کو عیاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فنِ خطاطی کی ترویج واشاعت میں مذہبی حصہ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اسلام نے علم کے حصول کو فرض قرار دیا ہے اور حصولِ علم کے لیے خطاطی لازم شے ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اسے مسلمانوں میں خاص اہمیت دی گئی ہے۔ مذہبی رجحان ہی اس فن کے پھلنے پھولنے کی اہم وجہ بنا۔ خطاطی دراصل مصوری کے قریب فن ہے۔ یہ فن دلفریب ہے۔ دلکش ولاجواب ہونے کے ساتھ ساتھ شاندار ماضی بھی رکھتا ہے۔ شاندار ماضی کا حامل یہ فن اب زوال پذیر ہوتا جا رہا ہے۔ آج کل اس فن کے چاہنے والوں کی تعداد مسلسل کم ہو رہی ہے۔ مگر ایک امید جو اس فن کے مستقبل میں روشنی کی ہے وہ کمپیوٹر سافٹ وئیر ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سافٹ وئیر مستقبل میں اس فن کو زندہ رکھیں۔ مگر مشین کے کام کو آرٹ کہنا سوائے دل کی تسلی کے اور کچھ نہ ہو گا۔ فنِ خطاطی ہاتھ کے کام کو ہی کہا جائے گا۔

فن کے ناقدین نے آرٹ کو "زندگی کا آئینہ" قرار دیا ہے۔ کسی حد تک یہ بات حقیقت کے قریب ہے مگر اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بالکل درست ہے۔ مگر زیادہ تر اس سے غلط فہمیوں نے جنم لیا۔ فن اس لحاظ سے آئینہ ضرور ہے کہ اس کا آغاز کسی شے یا انسان کو بطورِ نمونہ لینے سے ہوتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا ہے اس میں اتنی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں کہ وہ اپنے اولین نمونے سے صرف خارجی صورت تک ہی مشابہ رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو فن صرف تصویر کشی تک ہی محدود رہ جائے۔ اس میں موجود معنی خیزی اور پُر اسراریت پیدا نہ ہو سکے جو کہ فن کے لیے لازم ہے۔ تجریدی آرٹ کو اس سلسلے میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ آرٹ میں پہلی ضرب تو کسی مصور یا خطاط کی اندرونی کیفیت مثلاً مسرت و انبساط، غم و حزن یا برہمی کی مظہر ہو گی مگر جیسے ہی کینوس فنکار کے ہاتھ دوسری ضرب کے لیے اٹھتے ہیں تو ان کا پہلی ضرب کے ساتھ خود بخود براہ راست تعلق قائم ہو جائے گا۔ اور یوں آرنلڈ ریڈ کے مطابق اس کا مفہوم پہلی ضرب کو ہٹانے سے متعین نہیں ہو سکے گا۔ فن کے کسی بھی مکتب میں اتنی آزادی نہیں جتنی کہ خطاطی اور تجریدی آرٹ میں موجود ہے۔ آرٹ چاہے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو جب تک اس کے لیے ایک نئے معنی کی شمع روشن نہیں ہوتی اس کی حیثیت صرف نقالی سی ہوتی ہے۔ میمونہ انصاری مضمون "فن خطاطی اور آج کا انسان" میں اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> "خطاطی دل کو لبھاتی ہے، وہ نگاہ کو آشنا کرتی ہے، یہ دل کو شناس کرتی ہے۔ وہ دماغ کو مست اور بے خود بناتی ہے۔ یہ روح کو بالیدگی دیتی ہے۔ خطاطی میں حرکات و سکنات متکلم و

مترتم ہیں۔ وہ دیکھے جاتے ہیں یہ بولے جاتے ہیں۔ وہ بے جان ہیں یہ جاندار بھی اور شاندار بھی۔ وہ رنگ وزنگ سے بنتے بگڑتے رہتے ہیں، یہ خون جگر سے اور بصیرت قلب کی روشنائی سے لکھے اور دل ودماغ پر نقش کئے جاتے ہیں اور مرتسم بھی کئے جاتے ہیں۔ یہ آنکھوں میں سما جاتے ہیں وہ دل میں اتر آتے ہیں۔ مصوری کے نقوش جہاں اترتے ہیں خطاطی کے نقوش دل میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اگر مصوری قوت متخیلہ کی رفعت ورافت ہے تو خطاطی جمالیاتی ورومانی شان امتزاج کی تشکیل بھی ہے اور تکمیل بھی، تحصیل بھی اور تحویل بھی، تحریر بھی اور تقریر بھی تعبیر بھی اور تصویر بھی۔ وہ اگر تخیل ہے تو یہ تشکیل۔ وہ اگر تعبیر ہے تو یہ تصویر، وہ اگر تدبیر ہے تو یہ اس کی تقدیر، مظاہر فطرت کی وہ ساکت تصویر ہے اور یہ مظاہر فطرت کی گویا تصویر۔ یہ وہ حسین وجمیل تصویر ہے جس کے زیر زبر میں زمین و آسمان کو زیر وزبر ہونے دیکھا گیا ہے۔ جس کے دور و دامن میں قرون و عہود کی تواریخ اس کے ثقافتی گنجہاتے گراں مایہ کو بولتے سنا ہے۔ جس کے مراکز واعراب میں خزائن الفتوح اور قصور النوادر کو مجتمع ہوتے دیکھا ہے۔ جس کی نشست وکرسی میں شہنشاہوں اور تاجوروں اور ملوک و ملائک کی کرسی و تخت و تاج جمتے اور سنورتے دیکھے ہیں۔"۳۱

خطاطی کی دنیا عجیب دنیا ہے جس کے ایک دور میں کسی فنکار کی صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا تو دوسرے وقت میں اسی فنکار کو سر کا تاج سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے خطاطی کی معاصر تاریخ کو درست انداز میں بیان کرنا از حد دقیق کام ہے۔ تجربات ومشاہدات سے لے کر امکانات تک خاص ثقافتی، سیاسی اور سماجی ترجیحات کا غبار قریبِ نظر کے گونا گو سامان پیدا کر دیتا ہے۔ ان رحجانات اور میلانات سے کبھی تو اچانک لوٹ آتے ہیں کہ مؤرخ یا نقاد اس کا احاطہ کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں مگر اس کے باوجود ایک نقاد یا مؤرخ کی بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ وہ فنون کے ہر باب کا مکمل احاطہ کر کے اس کی ایسی تاریخ لکھے کہ پڑھنے والے کے ذوق میں اضافہ ہو۔ اور اس کی اس فن کی جانب رغبت میں اضافہ ہو۔ پاکستان میں خطاطی کے رحجان کے بانی شاکر علی ہیں۔ مصورانہ خطاطی میں جو مقام و مرتبہ ان کو حاصل ہے وہ کسی اور کے حصے میں نہ آسکا۔ انہوں نے خود کو مختصر مگر جامع کام کی بدولت خود کو "جدید خطاطی "کا بانی کہلوایا۔ ان کے بعد اصغر کمال اور صادقین نے مصورانی خطاطی میں اہم اور نمایاں کام

کیا۔ انہوں نے باقاعدہ تحریکوں کی صورت میں اس فن کو آگے بڑھایا۔ سید پروین فنا "صادقین" مضمون میں اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

" ایک ایسا فن کار، جس کی تخلیق تہہ در تہہ اور پرت در پرت معنی و مفاہیم کی دُنیائیں دریافت کرتی ہے۔ ایک ایسا فن کار، جس کی سرشت میں موجود کرب، اضطراب اور سینے میں لگی آگ اُس وقت تک ٹھنڈی نہیں ہوتی کہ جب تک اُسے تخلیق کا پُرشور پانی بُجھا نہیں دیتا۔ ایک ایسا فن کار، جو کائنات کو تخیّل کی آنکھ سے دیکھتا، مفکّر کے ذہن سے سوچتا اور خطاط کے قلم سے سمجھتا ہے۔۔"۳۲

فن کی دُنیا میں صادقین کی اوّل و آخر رہنما فطرت تھی۔ وہ فطرت، جس نے صادقین کو اُس کے فن کے اظہار کے نِت نئے موضوعات دیے۔ کائنات، اُس کا خالق، ابنِ آدم اور اُس کی جستجو صادقین کی مصوّرانہ طبیعت کے اہم موضوعات تھے۔ شعور، تہذیب، تحیّر، جستجو اور علم کے خمیر سے تیار ہونے والی صادقین کی شخصیت پر مصوّر کا چہرہ ہی منطبق ہو سکتا تھا۔ ایک ایسا چہرہ، جس میں کائنات کا چہرہ نظر آتا ہو۔ نامعلوم کو معلوم اور گمان کو یقین کا پیرہن عطا کرنا، صادقین کے لیے ایک دِل چسپ کارِ مشغلہ تھا۔ اُنہوں نے اپنا فن، سماج سے تشکیل دیا اور اپنے سماج کو اپنے فن سے تشکیل دیا۔ گویااُن کے فن کا سب سے طاقت وَر محرّک سماج رہا۔

آپ خطّاطی کے فن سے اسلامی خطّاطی میں داخل ہوئے، تو ذہن کی پاکیزگی کینوس کی شائستگی کا رُوپ اختیار کر گئی۔ سورۂ رحمٰن، سورۂ یٰسین اور قرآنی خطّاطی کے دیگر نمونے دیکھنے والوں کے دِلوں کو چُھونے لگے۔ غالبؔ، اقبالؔ اور فیضؔ کے اشعار کو تصویری پیکر عطا کیا۔ صادقین کے بعد اس ملک میں مصورانہ خطاطی میں دوسرا بڑا نام اسلم کمال کا ہے۔ اس کا اسلوب باقی خطاطوں سے منفرد اور جداگانہ ہے۔ مثلث ان کے اسلوب کی اہم اکائی ہے۔ انہوں نے خطاطی کے نئے اور منفرد طریقوں سے دنیا کو روشناس کروایا۔ قدیم اور جدید خطاطی اپنے پُر وقار اور دیدہ زیب خزانوں کے پر کھول رہی ہے۔ لیکن جدید مصور خطاطوں میں جدت، تنوع، دلکشی اور انفرادیت جو ہر نظر آتے ہیں وہ اس سے قبل دیکھنے کو نہیں ملے۔ ان فن پاروں میں انفرادیت کے حسین رنگوں کی وجہ سے ہر فن پارہ بہت دور سے ہی اپنے خالق کا نام بتا دیتا ہے۔

ایران، افغانستان اور برصغیر پاک وہند کے خطاطوں نے خطاطی میں کمال فن کے اعلیٰ ترین نمونے تخلیق کیے، آج دنیا میں برصغیر پاک وہند کی صدیوں پر محیط اس محنت کے شاہکار جابجا عوام الناس کی آنکھوں کو خیرہ کیے ہوئے ہیں، سرکنڈے کے قلم سے اپنی تحریروں کو مزین کرنے والے خطاطوں نے دور جدید میں برش کا سہارا لے کر مزید جدت اور خوبصورتی کے رنگ بھرنا شروع کر دیے، خوبصورت رنگوں سے کھیل کر اور مختلف اسٹائل متعارف کرواکر پاکستان میں بھی آرٹسٹ اور کیلیگرافرز نے بہت نام کمایا ہے۔ لیکن عام خطاطی کو مصورانہ خطاطی میں ڈھال کر خوبصورت رنگوں کی ملمع کاری کر کے جن کیلیگرافرز نے بے پناہ شہرت حاصل کی ہے ان میں صادقین، گل جی، حنیف رامے، اسلم کمال، اصغر مغل اور دیگر کئی نام شامل ہیں۔

اصغر مغل وہ نابغہ فنکار ہے جس نے خطاطی بلکہ آیاتِ قرانیہ اور احادیثِ مقدسہ کی خطاطی کو ایک نئ اور منفرد جہت سے روشناس کرایا۔ ان کا یہ متبرک اور مقدس فن جہاں عبادت کے زمرے میں آتا ہے وہاں اُن کے رزقِ حلال کا باعزت ذریعہ بھی بن گیا ہے۔ بغیر برش مصورانہ خطاطی کے اس ہنر کو لازوال رفعتوں سے روشناس کرانا اصغر مغل کا ایسا اعزاز ہے جو بلاشبہ انہیں کا امتیاز ہے۔ اُن کے روحانی فن پاروں کو دیکھ کو جو آنکھوں کو طراوت اور دل کو تسکین ملتی ہے، کوئی اور مادی نعمت اس کا متبادل ہو ہی نہیں سکتی۔

اصغر مغل اس اچھوتے فن کو مسلسل آگے بڑھا رہے ہیں۔ آئے دن وہ اپنے اس محیر العقول ہنر کے ایسے ایسے معجزے دکھا رہے ہیں کہ عقل حیران اور ششدر رہ جاتی ہے۔ انہوں نے بغیر برش کے فن خطاطی کے جوہر دکھا کر دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے، انہوں نے اللہ رب العزت کی بنائی ہوئی اس خوبصورت کائنات سے رنگ چرا کر اپنی کینوس میں بھر لئے ہیں۔ اصغر مغل کا کام اتنا نفیس اور دیدہ زیب ہے کہ اس نے کمپیوٹر کو بھی مات دے دی ہے۔ اصغر مغل دنیا کے واحد آرٹسٹ ہیں جو بغیر برش استعمال کئے فنِ خطاطی اور پینٹنگ کے ماہر ہیں۔ اصغر مغل، گل جی، صادقین، حنیف رامے اور اسلم کمال کے بعد واحد آرٹسٹ ہیں جنہوں نے دنیا میں اپنا جدید فن متعارف کروایا ہے۔ اور یہ فن اصغر مغل کو قدرت کی طرف سے تحفہ میں ملا ہے۔ جس نے اپنی محنت اور لگن سے خطاطی کی دنیا کو دوام بخشا۔ میمونہ انصاری مضمون "فن خطاطی اور آج کا انسان" میں اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

"اصغر مغل نے نہ صرف مصوری اور پینٹنگ کی ہے بلکہ انہوں نے خطاطی میں مصورانہ رنگ پیش کر کے ایک جداگانہ رنگ متعارف کروایا ہے۔ اُن کی مصوری و خطاطی میں برش کا استعمال نہیں ہوتا، صرف رنگ باتیں کرتے ہیں اور باتوں سے خوشبو آتی ہے۔ ان کے رنگ کینوس پر بکھرتے ہیں تو انوکھے انداز کی قوسِ قزح تخلیق ہو جاتی ہے۔ اُن کی مصورانہ خطاطی میں اسلامی رنگ جھلکتا ہے۔ اکثر وہ اظہار کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے فن کو قرآن و حدیث کی اشاعت کا ذریعہ بنایا ہے کہ شاید میری یہی کاوش میری بخشش کا سامان بن جائے۔"۳۳

محمد اصغر مغل فنونِ لطیفہ میں جس قد کاٹھ کے فنکار ہیں اُس کا اعتراف ہمارے ملک میں اس انداز سے نہیں کیا گیا جس کے وہ حقدار ہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ زیر نظر تحریر اربابِ بست و کشاد کے اس سوئے احساس کو بیدار کر دے اور اصغر مغل کو ان کا صحیح مقام دلوانے کا ذریعہ بن جائے۔

د۔ سنگ تراشی:

سنگ تراشی کا مفہوم نقش و نگار اور کندہ کاری کے ضمن میں لیا جاتا ہے۔ عمارت اور دوسری ضرورتِ زندگی کی اشیاء کے لیے پتھر کی چیزیں بنانے کا فن سنگ تراشی کہلاتا ہے۔

سہ ماہی "سیپ" میں فنِ سنگ تراشی سے متعلق مختلف شمارہ جات میں شائع ہونے والے چنیدہ مضامین میں "فنِ سنگ تراشی اور ہم" از عدیل احمد (شمارہ ۴، ۱۹۶۵ء)، "فنِ سنگ تراشی اور انسانی اقدار" از آفتاب حیدر (شمارہ ۹، ۱۹۶۹ء)، "گندھارا تہذیب کے فنون" از صغیرہ نسیم (شمارہ ۴، ۱۹۶۵ء)، "مسعود کوہاری کا فن سنگ تراشی" از عباس شاہ اور "رمضان ماما- ایک عظیم سنگ تراش" (شمارہ ۷۰، ۲۰۱۲) شامل ہیں۔ مذکورہ مضامین میں فنِ سنگ تراشی کی تفہیم و توضیح کے ساتھ ابتدا اور تاریخ و ارتقا، سنگ تراش کی شخصیت اور حسنِ جمال کے اظہار و تاثر کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سنگ تراشی ایک پیچیدہ فن ہے، جس کی دل فریبی، حُسن آفرینی اور اثر پذیری کو صاحبِ جمال ہی محسوس کرتا ہے، تاہم دیگر فنون کے ذوقِ جمال اور سنگ تراشی ایسے دقیق فن کے ذوقِ حُسن میں بیّن تفاوت ہے۔ سنگ تراش کی حسِ جمال کی بلندی کا اندازہ کیجیے کہ پاؤں تلے پڑے حقیر پتھروں، نوکیلی بے ڈھبی چٹانوں اور بلند و بالا کہساروں کو کاٹ کر وسعتِ فہم اور ترفعِ تخیل سے انھیں جاذبیت عطا کرنے ساتھ معانی و

مفاہیم کا لبادہ بھی اوڑھا دیتا ہے۔ سنگ تراش پتھروں اور چٹانوں سے حُسنِ محض تخلیق نہیں کرتا، بلکہ با معنی پیکر تراشی کرتا ہے۔ سنگ تراشی سے متشکل ہونے والے جمال و معانی سے مزین شاہ کار زاہد ہمایوں کے پیش کردہ نظریہ تحریکِ جمالیات کے مکمل عکاس ہوتے ہیں۔ تحریک جمالیات کے تینوں مراحل اس فن پر بھی محیط ہیں۔ ناظر اپنے ذوقِ جمال کے تحت حسِ بصارت سے سنگ تراشی کی تخلیق کے ظاہری جمال سے محظوظ ہوتا ہے، حسِ بصارت کے جمال کی تسکین حسِ بصیرت میں ارتعاش پیدا کرتے ہوئے شعور و وجدان کی مسرت طلبی کو متحرک کرتی ہے، تخلیق میں پنہاں معانی کی تفہیم اور تخلیق و معانی سے پیدا شدہ جمالیاتی آہنگ سے وجدانی حظ ناظر کی طبعیت کو سرشار کرتا ہے۔ بعد ازاں وجدانی حسِ جمال کی تشفی ناظر کے ذہنی معیار کو بلند کرتے ہوئے لاشعور تک رسائی حاصل کرتی ہے، لاشعور میں مضمر افکارِ نو کی دریافت سے ناظر پر تدارک و دریافت کا الگ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، تخیل کی وسعت و تنوع اس کے لیے باعثِ طمانیت ہے۔

ا۔ سنگ تراشی کی روایت کے مضامین:

سنگ تراشی ایک فنِ لطیف ہے جس کی لطافت کو سنسکرت زبان میں "آنند" کہتے ہیں۔ یہ ایک جمالیاتی دائرہ ہے۔ جو کبھی وسیع سے وسیع تر تو بھی انتہائی تنگ ہو سکتا ہے۔ اس کا انحصار تخلیق کار اور فن کار کی خداداد صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔ سنگ تراش کی حسِ جمال اس فن میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے، نیز اس فن سے لُطف اٹھانے اور اس کے ذریعے وجدانی وسعت حاصل کرنے کے لیے ناظرین کا معیارِ جمال بھی اساسی اہمیت کا حامل ہے۔ سنگ تراشی ایک دقیق فن ہے، جس کا معیارِ حُسن ہر انسان نہیں سمجھ سکتا، فنِ سنگ تراشی انھی انسانوں کے لیے باعثِ علم و تسکین ہو سکتا ہے، جو اس فن کی سوجھ بوجھ کے ساتھ ایک خاص ذوقِ جمال رکھتے ہوں۔ سنگ تراش اپنے معیارِ حُسن کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی انگلیوں کے پوروں کو خام اور بدھے پتھروں سے پیکرِ حُسن دریافت کرنے میں گِھسا دیتا ہے۔ ناظر اس حُسن کو براہِ راست دیکھ کر اس کی لطافت سے متاثر ہوتے ہوئے مسرت حاصل کرتا ہے، اگر ناظر کا ذوقِ جمال پتھروں کی خوب صورتی محسوس کرنے سے قاصر ہے تو تخلیقی شاہ کار پر غور و فکر کے ذریعے وہ تخلیق اور بہ ذریعہِ تخلیق اظہارِ مدعا کے تعلق کی تفہیم کے ذریعے وجدانی احساس سے لُطف اٹھا سکتا ہے۔ سنگ تراشی محض خام پتھروں اور نوکیلی چٹانوں کی تراش خراش سے نکالی گئی خوب صورت پتھروں کی پیش کش نہیں ہوتی ہے بلکہ سنگ تراش اپنے جذبات و احساسات اور مدعا و پیغامات کو ذوقِ جمال کے

پیرہن میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ مجسم تخلیق کے پس پردہ معانی ومفاہیم کی تفہیم ناظر کے وجدانی ذوقِ جمال کی تسکین کرتی ہے۔ حواس کے ذریعے لُطفِ ظاہری کا حظ اور وجدانی ذوقِ جمال کی آسودگی کا ارتباط ناظر کے خیالات کی توسیع کرتے ہوئے نئی فکریات کا موجب بنتی ہے۔

موجودہ زمانے کا فن سنگ تراشی انسان کے وجود اور اس کی ذات کے گرد گھومتا دکھائی دیتا ہے۔۔ آزاد فضا میں سنگ تراش، فلسفی اور مصور اپنی ذات اور کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جو شے ان تمام علوم کی بنیاد ہے وہ جنون اور عشق ہے۔ پھر وہ عشق چاہے مکاں ہو یا لامکاں کا، عشق ہی وہ جذبہ ہے جس سے سارے عالم کی رونق قائم ودائم ہے۔ تمام فنونِ لطیفہ صادقوں، عاشقوں کا تخیل ہی تو ہیں۔ سنگ تراشی ایک فن ہے جو ٹیلی ویژن کی تصویر کی طرح متحرک نہیں بلکہ ساکت ہے اس میں ایسا سکون ہے جس کی خاموشی اور نقوش بیاں در بیان ہیں۔ اس خاموشی میں فن وادب دونوں پائے جاتے ہیں۔ دنیا کے تمام بڑے سنگ تراشوں کا یہی کمال ہے کہ وہ خاموش وجود کو زبان عطا کرتے ہیں۔ اور ساکن مادے کو متحرک کر دیتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے انسان خود سے ہم کلام ہو کر اپنے ضمیر کو بیدار کر سکے۔ سنگ تراشی موجودہ دور کی ہو یا قدیم کی اس کی خوبصورتی کا تعلق دیکھنے والے کی ذوقِ نظر سے ہوتا ہے۔ سنگ تراشی کا عمل دو چیزوں سے جڑا ہوتا ہے۔ اول یہ کہ باپردہ کو بے پردہ کرنے اور دوم فنکار خود شناسی کی تلاش میں ہو۔ خود شناسی کا عمل سنگ تراشی پر مکمل نہیں ہوتا بلکہ وہ صاحبِ بصارت افراد کو بھی خود آگہی کا درس دیتا ہے۔ اس لیے فنونِ لطیفہ اور دیگر فنون لطیف میں کوئی خاص فرق نہیں۔ تمام فنون لطیف انسانی تہذیب و ثقافت میں بتدریج نشوونما کا باعث بنتے ہیں مگر سنگ تراشی اس میں بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اس ضمن میں عدیل احمد اپنے مضمون "فن سنگ تراشی اور ہم" میں لکھتے ہیں:

> "آج فقط اُن بے جان پیلے پتھروں کا ذکر کرتے ہیں جن پر جب ماہر اُستادوں کی چھینی اور ہتھوڑی کی مار پڑی تو ان پتھروں پر کیفیتوں کی نہ جانے کتنی خوبصورتیاں ساکن ہو گئیں۔ فن میں نفاست اور نزاکت کی حد یہ کہ محسوس ہوتا ہے کہ ابھی ہوا کا جھونکا لگے گا اور پتھر پر بنا پھول جھُوم اُٹھے گا اور اس کی خُوشبو چہار سو بکھر جائے گی۔"۴۴

سنگ تراشی ایک قدیم فن ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا سانچہ خالقِ کائنات نے خود تخلیق کیا۔ تاریخ کائنات کا وہ واحد مجسمہ تھا جو کہ ساکن نہیں تھا بلکہ احساس و جذبات کا

حامل متحرک مجسمہ تھا۔ جسے انسان کا نام دیا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خالقِ کائنات نے پہلے خود مجسمہ تراش کر انسان تخلیق کیا اور پھر مجسمہ سازی کو ممنوع قرار دیا۔ دنیا کے تمام بڑے مذاہب کے اوائل کو اگر دیکھا جائے تو اس میں سنگ تراشی کو ناپسندیدہ قرار دے کر ممنوع کیا گیا ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ مذہب ہی تھا جس کے زیرِ اثر سنگ تراشی کے فن کو دوام حاصل ہوا۔ مضمون نگار میاں آصف نے اپنی تحریر "مجسموں کی دُنیا" میں ذوقِ جمال کے تحت سنگ تراشی اور مجسمے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> "سنگ تراشی ایک ایسا عمل ہے جو انسانی جمالیاتی ذوق کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی عزم و ہمت کی تاریخ بھی سناتا ہے۔ سنگ تراشی کے ذریعے انسان اپنی سیاسی، ادبی، سماجی محسنوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ اور ان مجسموں سے اپنی شاہراؤں کو مزین کرتے ہیں"۳۵

تاریخ میں اُس پتھر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے جس پر کوئی لکھائی یا نقش و نگار ہو یا کسی ایسے مقصد کے لئے استعمال ہوا ہو جو سینکڑوں سال بعد لوگوں کی دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے۔ قدیم زمانہ کے پتھروں اور غاروں کے ادوار میں مجسمہ سازی کسی حد تک ایک زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ انسان سنگ تراشی کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ فن منظر کشی کے ساتھ ساتھ احساسات کی ترجمانی کا ذریعہ بھی بن گیا۔ پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد اس خطہ کی سنگ تراشی میں خاصی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے فگر ورک پر توجہ زیادہ تھی اور ساتھ ہی سنگ تراشی بھی اپنے عروج پر تھی۔ آرٹ سوسائٹی کی عکاسی کرتا ہے۔ فرانس اور سپین میں قدیم دور میں غاروں میں بنائے گے مصوری کے شاہکار غار کا ہی حصہ معلوم ہوتے تھے۔ ہمیں ان تاریخی مقامات میں جو سنگتراشی نظر آتی ہے، وہ اپنے زمانوں کے حالات، واقعات، حقائق اور کیفیتوں کا مظہر ہے اور یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جو ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ یہ سارے مقامات اپنی الگ الگ حیثیت اور حقیقت رکھتے ہیں، اس لیے سنگتراشی کی اس دنیا کو ہمیں تین مختلف تاریخی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت پڑے گی۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں ان کے حقیقی پس منظر میں دیکھ کر ہی ان کی خوبصورتی میں اور اضافہ ہو جائے۔

۲۔ شخصیتِ سنگ تراش پر مضامین:

بیسویں صدی میں سنگ تراشی، مجسمہ سازی اور مصوری ایک وسیع شعبے کی صورت اختیار کر گئیں۔ سنگ تراشی کو عروج مصریوں نے دیا۔ مصریوں نے مصری مقبروں میں پتھر سے بنی ہوئی آرائشوں کو دکھایا۔ یہ

آرائشیں گزرے ہوئے شہنشاہوں اور بادشاہوں کی شان و شوکت کو ظاہر کرتے تھے۔ یونانی اپنی دیوی، دیوتاؤں کی محبت انسانی صورت میں دکھانے کے لیے طرح طرح کے سنگِ مرمر اور قیمتی پتھروں کے مجسمے تراشا کرتے تھے۔ مقدس ہستوں کے مجسمے بنانے کے لیے سونے، چاندی اور کانسی کو معتبر سمجھا جاتا تھا۔ یونانیوں کے زیرِ اثر رومیوں نے بھی پتھر سے مجسمے بنانا شروع کر دیے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں مٹی سے تخلیقات کی جگہ کافی حد تک پتھروں اور دھاتوں نے لے لی تھیں۔ سنگ تراش ایک دوہرائے کھڑے تھے کہ یا تو وہ ماضی میں ہونے والے کام کی نقل کرتے اور پرانے طریقوں پر چلتے ہوئے فن پارے تخلیق کرتے یا پھر نئی سوچ و فکر کو اپناتے ہوئے نئے تجربات کرتے۔ جدید سنگ تراشوں نے دوسرا راستہ چنا۔ فنِ سنگ تراشی کو جمالیاتی معیار و ذوق کا اہم شارح کہا جا سکتا ہے، اس سبب سے سنگ تراش کا معیارِ حُسن اور ذوقِ جمال دیگر فنونِ لطیفہ کے جمالیاتی معیار اور ذوق سے الگ ہوتا ہے۔ حسین شے کی تخلیق اور بد نما شکل کو حسین قالب میں ڈھالنا دو متفرق پہلو ہیں، یہی تفاوت دیگر فن کاروں کے ذوقِ جمال سے سنگ تراش کے ذوقِ جمال کو الگ کرتا ہے۔ بے ہیت، بد نما، نوکیلے اور خام پتھروں اور چٹانوں سے بامعنی حُسن دریافت کرنا، ذوقِ جمال کی منفرد صورت ہے۔ جمالیات کے اس معیار تک رسائی کے لیے تخلیق اور تخلیق کار کے ذوقِ حُسن سے آگاہی کے ساتھ ناظر کے اپنے ذوقِ حُسن کا معیار کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

بہ یک وقت خطاط، مصور اور سنگ تراش ایاز گل کا نام سنگ تراشی کی دنیا میں معتبر ہے۔ انسان کے اصل روپ کی تلاش میں ایاز نے مجسمے تراشے۔ اس فن کار کے فن پارے حقیقت زندگی، خواب اور جرات و بہادری کی علامت ہیں ایاز گل کی پہلی ترجیح سنگ تراشی رہی۔ اس نے پتھروں کی کانٹ چھانٹ سے خوبصورت مجسمے تخلیق کیے۔ اس کے علاوہ مٹی اور لکڑی سے بھی ایسی تخلیقات کیں جو کہ انتہائی خوبصورت اور دلفریب تھیں۔

انسانی تاریخ، رہن سہن اور بود و باش کے بارے میں نہ ختم ہونے والے مطالعہ اور معلومات نسل در نسل منتقل کرنے میں سنگ تراشی یا پتھروں پر کندہ کاری نے بنیادی کردار ادا کیا ہے، لیکن علاقائی صورتحال کے تناظر میں مذکورہ فن بھی مذہبی شدت پسندی کی نذر ہوا۔ مجسمہ سازوں نے نہ صرف اپنے فن کو چھپائے رکھا بلکہ کئی افراد نے اس کو خیر آباد کہہ کر ہمیشہ کے لیے اس سے منہ موڑ لیا۔ موجودہ دور میں بھی مذکورہ فن کی اہمیت کم نہیں ہوئی لیکن اب یہ پتھر پر صرف لکھائی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

الیاس اُستاد کے فن پارے اپنی مثال آپ ہیں، جہاں اُنہوں نے پتھر کی سِلوں کو تراش خراش کر خوبصورت ڈیزائن اور پھول بوٹے بنائے ہیں وہاں پتھر کی اُنہی سِلوں (سلیٹ) پر اُن کی کندہ کی ہوئی آیات کریمہ اور خوبصورت اشعار وغیرہ بھی قابل دید ہیں۔ عدیل احمد **مضمون** "۔ فن سنگ تراشی اور ہندوستان "میں اس حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

> "اُن کے تخلیق کردہ فن پارے نہ صرف گھروں، دفتروں وغیرہ میں بطور آرائشی اشیاء کے استعمال کیا رہاہے بلکہ کئی ایک ادارے / افراد اُن کو بطور سوینئیر بھی لے رہے ہیں، ان کے ساتھ ہی کئی ایک گھریلو استعمال کے خوبصورت سامان بھی بنائے ہیں جن میں سلیٹ پتھر کی سلوں سے بنائے گئے خوبصورت اور دیدہ زیب ٹرے، پھول دان، مخروطی اور عمودی پردے اور دیواروں پر سجانے کے لئے خوبصورت سلیٹ جن کو لکڑی کے نفیس فریمز میں بند کر کے بنایا گیاہے۔"۳۶

الیاس اُستاد نے حکومت سے درخواست کی کہ پانچ، دس ہزار انعام دینے کے بجائے اگر اس فن کو زندہ رکھنے کے لئے باقاعدہ کوئی ادارہ بنائے اور سرکاری سرپرستی میں اس کو توسیع دی جائے تو یہ فن زندہ رہے گا اور نوجوان ہنر مند اس میدان میں بھی اپنے ہنر کے جلوے بکھیریں گے اور اُن کے کام کو بیرون ملک بر آمد کر کے اچھاخاصہ زرمبادلہ کمایا جاسکتاہے۔ اُن کے تخلیق کئے ہوئے کچھ فن پاروں کی تصاویر پیش خدمت ہیں۔

پچاس سالہ گلزار علی جو کہ نوشہرہ بازار میں سنگ تراشی کی کاروبار کر رہاہے اور یہ اُس کا خاندانی پیشہ ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ تقریباً ایک سو پچاس سال پہلے اُن کے آباؤ آجداد مانکی شریف میں گھر بنانے، لکڑی سے مختلف چیزیں تیار کرنے اور بعد میں پتھروں پر نقش و نگار کا کام شروع کیا تھا۔ پرانی قبرستانوں میں میرے دادا عبد المجید کے ہاتھ کے لکھی ہوئی آثار اب بھی موجود ہے۔ اگر چہ وہ تعلیم یافتہ نہیں تھا بس لوگ اُس کو لکھائی لے کر اُس کے مطابق وہ پتھر پر اُس کو نقوش کر لے تھے۔

مگر یہاں کچھ لمحے ٹھہرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ یہ بات ہماری ذہن میں رہنی چاہیے کہ ان سارے قبرستانوں اور تاریخی عمارات کو ایک زمانے یا ایک دور کے حوالے سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ جہاں سنگتراشی کے مُوڈ

اور منظر بدلتے ہیں وہاں زمانے اور حالات بھی بدل جاتے ہیں۔ یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ سنگتراشی کا ردھم بدلتا ہی تب ہے جب معروضی حالتیں بدلتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ آصف جہانگیر، سیپ کے تخلیقی اور فکری کردار کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۲، ص:۳

۲۔ نسیم درانی، انٹرویو: شمیم نوید، آصف مالک، قرطاس ادب، روزنامہ، ایکسپریس، ۳۰ دسمبر ۲۰۰۴، بوقتِ شام ۴ بجے

۳۔ میمونہ انصاری، ڈاکٹر، ادب برائے زندگی، (مضمون)، سیپ، شمارہ ۷ جون ۱۹۶۶، سیپ پبلی کیشنز، کراچی، ص:۲۵

۴۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر، مذہب اور شاعری، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۹۵، ص۹۸

۵۔ محبوب اللہ، مغل فن مصوری (مضمون)، سیپ شمارہ نمبر ۲، ۱۹۶۴، سیپ پبلی کیشنز، کراچی۔ ص۳۳۹

۶۔ ایضاً، ص:۳۲۸

۷۔ حفیظ انیس، تخلیق اور تخلیق کار، (مضمون) سیپ، شمارہ ۷۴، ۲۰۰۵، سیپ پبلی کیشنز، کراچی، ص:۲۶

۸۔ ایضاً، ص:۲۸

۹۔ ایضاً، ص:۲۹

۱۰۔ ایضاً، ص:۳۰

۱۱۔ ایضاً، ص:۳۰

۱۲۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر، مغرب میں مصوری، (مضمون) سیپ، شمارہ 3،، ۱۹۶۵ سیپ پبلی کیشنز، کراچی۔ ص ۳۹۲

۱۳۔ انعم جاوید، جدید مصوری، (مضمون) سیپ، شمارہ ۸، ۱۹۶۷، سیپ پبلی کیشنز، کراچی، ص:۲۰۶

۱۴۔ ایضاً، ص:۲۰۸

۱۵۔ ایضاً، ص:۲۰۹

۱۶۔ قیصر قلندر، ہماری موسیقی، گلریز پبلی کیشنز، ۱۹۰۸، ص:۶

۱۷۔ احمد علی، علمی رنگ موسیقی، (مضمون) سیپ، شمارہ ۱۰، ۱۹۷۳، سیپ پبلی کیشنز، کراچی۔ ص ۲۱۲

۱۸۔ ایضاً، ص:۲۱۳

۱۹۔ مرزا سلطان احمد، انسان اور موسیقی، (مضمون) سیپ، شمارہ ۷۴, ۲۰۱۵, سیپ پبلی کیشنز، کراچی۔ ص ۲۳۲

۲۰۔ ایضاً، ص:۲۳۱

۲۱۔ احمد علی، علمی رنگ موسیقی، (مضمون) سیپ، شمارہ ۱۰, ۱۹۷۳, سیپ پبلی کیشنز، کراچی۔ ص ۲۱۴

۲۲۔ عرفان احمد، موسیقی کا ارتقا، (مضمون) سیپ، شمارہ ۶۲, ۲۰۱۳, سیپ پبلی کیشنز، کراچی۔ ص ۳۳۴

۲۳۔ علی جعفری، موسیقی اور موسیقار، (مضمون) سیپ، شمارہ ۱۰, ۱۹۷۰, سیپ پبلی کیشنز، کراچی۔ ص ۲۸۹

۲۴۔ ایضاً، ص:۲۹۱

۲۵۔ جواز جعفری، ڈاکٹر، کلاسیکی گھرانوں میں موسیقی، (مضمون)، سیپ، شمارہ 75, ۲۰۱۵، سیپ پبلی کیشنز، کراچی، ص:۲۰۴

۲۶۔ سورہ العلق، آیت نمبر ۴

۲۷۔ سورہ القلم، آیت نمبر ا

۲۸۔ خورشید عالم گوہر، مخزن خطاطی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵، ص:۳۰

۲۹۔ ایضاً، ص ۳۲:

۳۰۔ میمونہ انصاری، فن خطاطی اور آج کا انسان (مضمون) سیپ شمارہ ۷، اپریل ۱۹۶۷، سیپ پبلی کیشنز، کراچی، ص:۳۱۲

۳۱۔ ایضاً، ص:۳۱۲

۳۲۔ ایضاً، ص:۳۱۳

۳۳۔ پروین فنا، سید، صادقین (مضمون) سیپ شمارہ ۶۸، مئی ۲۰۱۴، سیپ پبلی کیشنز، کراچی، ص:۱۱۷

۳۴۔ عدیل احمد، فنِ سنگ تراشی اور ہم، سیپ شمارہ ۴، مئی ۱۹۶۷، سیپ پبلی کیشنز، کراچی، ص:۳۶۷

۳۵۔ میاں آصف، مجسموں کی دنیا، فکشن ہاؤس، ۳۹ بک سٹریٹ، لاہور، ۲۰۱۰، ص:۰۷

۳۶۔ عدیل احمد، فنِ سنگ تراشی اور ہم، سیپ شمارہ ۴، مئی ۱۹۶۷، سیپ پبلی کیشنز، کراچی، ص:۳۶۸

باب سوم

"سہ ماہی ادبیات" کا فنون لطیفہ کے فروغ میں کردار

ا۔ سہ ماہی ادبیات:

اردو زبان و ادب کی ترویج میں رسائل و جرائد کا کلیدی کردار رہا ہے۔ مدرسوں اور تعلیمی اداروں میں نصابی کتب پڑھائی جاتی ہیں۔ یہاں کتب کا انتخاب موضوعات کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ مختلف علوم کے حصول کے لیے مختلف کتب پڑھائی جاتی ہیں۔ ایک کتاب عمومی طور پر ایک ہی موضوع پر تحریر کی جاتی ہے۔ اور مختلف موضوعات کے لیے مختلف کتب خریدنا پڑتی ہیں۔ جبکہ رسائل میں ہمیں ایک وقت میں مختلف موضوعات اور تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ موجودہ دور میں ہر کام میں جدت آئی ہے ہر چیز نے ڈھنگ بدلا ہے اس جدت نے کتب کے حصول کے ذرائع کو آسان بنایا ہے۔ انٹرنیٹ نے تو کتابوں تک رسائی کو مزید آسان بنا دیا ہے۔ جہاں تک اردو ادب بالخصوص رسائل و جرائد کی زندگی اور اہمیت کا تعلق ہے تو اس حقیقت اس انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حالیہ دہائیوں میں اس کے قارئین کی تعداد کم ہوئی ہے یہاں بھی وہ رسائل جو جامعاتی تحقیق و تنقید میں معاون تھے ان کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ مسلم ہے ان ہی چند زندہ اور مشہور رسائل میں ادبیات کا شمار ہوتا ہے۔ سہ ماہی ادبیات ایک نامور اور معتبر ادبی جریدہ جو کہ حکومتی سرپرستی میں اکادمی ادبیات پاکستان سے شائع ہوتا ہے اس کا اجراء ۱۹۸۷ء سے اسلام آباد سے اکادمی ادبیات نے کیا۔ اس کے نگران پروفیسر "پری خٹک" مدیرِ اعلیٰ سید ضمیر جعفری ہیں گزشتہ نصف صدی سے شائع ہونے والے سہ ماہی ادبیات کو رسائل کی دنیا میں انفرادی حیثیت حاصل ہے اس انفرادیت کی اہم وجہ اس رسالے کی پچاس سال سے مسلسل اشاعت ہے۔ مسلسل اشاعت کے باوجود اس کے معیار پر کبھی سمجھوتا نہیں کیا گیا۔ اس رسالے نے اپنی اشاعت سے لے کر آج تک تحقیق و تنقید کے اصول و ضوابط کو برقرار رکھا اور ان اصول و ضوابط پر کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ ادبیات زندگی اور اردو ادب کے اقدار کا دائمی نقیب ثابت ہوا۔

ادبیات کے اداریوں میں زندگی اور ادب کی اہمیت کو بڑے خوبصورت انداز میں بتایا گیا۔ ادبیات میں ہر طرح کی ادبی تخلیقات کو جگہ دی گئی ہے اور ایسے مضامین کو بھی شامل کیا گیا جو ادب اور زندگی کو لازم و ملزوم سمجھتے

ہیں کیونکہ ایک فنکار ادب کی شاہراؤں پر چلتے ہوئے ہی زندگی کی منازل کا تعین کرتا ہے۔ادب اور فن کار کے بغیر یہ معاشرہ بے جان ہے۔ادبیات میں ہر طرح کی تحریریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔یہ ایک غیر جانبدار مجلہ ہے جس کی پالیسی واضح اور ہر قسم کے تعصبات سے پاک ہے۔اس میں نئے آنے والے ادب کے لکھاریوں کو ایک پلیٹ فارم مہیا کیا جاتا ہے۔ہر ادبی مسلک یا ادبی طبقہ اگر اس کی تحریر جاندار ہے تو وہ ادبیات میں شائع کیا جائے گا۔ادبیات کے مدیران کو اس بات کا حساس ہے کہ ادب کو ادبی فرقہ واریت نے بہت نقصان پہنچایا۔اس لیے انہوں نے ایسی پالیسی بنائی جو کہ ہر قسم کے تعصبات سے اور فرقہ واریت سے پاک ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی سہ ماہی ادبیات اردو زبان وادب کی شمع فروزاں کر کے ادب کی راہوں کو منور کر رہا ہے۔

۲۔مصوری:

دنیا کے آغاز میں جب تہذیب وتمدن کے نام ونشان تک نہ تھے اور نہ ہی علوم وفنون تھے اس وقت پتھر کے مجسمے اور جانوروں کی کھالوں پر بنے نقش ونگار جو دنیا کے مختلف ممالک میں موجود تھے ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فنونِ لطیفہ اور دیگر علوم وفنون میں پہلی ایجاد مصوری کی ہے- دنیا میں موجود تمام چیزیں جنہیں ہم دیکھتے ہیں یہ سب مورتیں یا اشکال ہیں۔مصوری کی سب سے بہترین جھلک یہ پوری کائنات ہے۔سب سے بڑا مصور مالک کائنات ہے قدرت نے ہمارے سامنے بے شمار اشکال وصورتیں پیش کی ہیں- جن کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔حیوانات، نباتات، جمادات نیز کہ اس نظامِ کائنات کی ہر شے خوبصورت صورتیں لیے ہوئے ہے ہر تصویر رنگ قدرت کی بے مثال حکمت کا نمونہ ہے۔

مصوری اور سامانِ مصوری قدرت بھی ہیں اور قدرتی بھی-قدرت نے جو کچھ تخلیق کیا جو کہ تصویر کی مانند ہے-اللہ تعالیٰ نے انسان میں پیدائشی طور پر ہی تخلیقی صلاحیت رکھی- گویا تصویر کشی قدرتی طور پر انسان کے اندر ودیعت کی گئی-انسان مصوری کی صورت میں دیکھنے والے میں جمالیاتی تجربہ منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔تحریر اظہار کی مکمل حقیقت کی عکاس نہیں ہو سکتی۔اس کے متضاد ایک مصور رنگوں سے تصویر میں خیال یا آنکھوں دیکھے منظر کو یوں رنگتا ہے کہ حقیقت کا گماں ہونے لگتا ہے۔آرٹ میں مصوری ہی وہ فن ہے جو حقیقت کو کینوس پر بکھیر دیتی ہے۔فنکار تخلیق کے معاملے میں رب جیسی طاقت رکھتا ہے مگر خالق اور مخلوق کے فرق کی وجہ سے مہارت میں مار کھا جاتا ہے۔

اس اعتبار سے اگر جمالیاتی ذوق کی تعریف کی جائے تو اس سے مراد ہوش و حواس کے ذریعے آرٹ کے تصور کو محسوس کرنا، مصور کی ہر صورت کسی نہ کسی طریقے سے جمالیاتی اقدار کو ظاہر کرتی ہے- موسیقی اور شاعری کی طرح مصوری بھی انسان کے لطف، احساسات اور جذبات کو ابھارتی ہے- بلکہ مصوری کو اگر تمام حدود کے ساتھ صحیح پیش کیا جائے تو وہ اتنا اچھا تصور پیش کرتی ہے جس کو شاعری یا موسیقی بھی پیش نہ کر سکیں۔ ایک تصویر سے جذبات و احساس اور خوشی و غم کے احساسات کو بخوبی دوسروں تک پہنچایا جا سکتا ہے- شاید ہی کسی فن کو اتنا لطیف اور حساس سمجھا گیا ہو جتنا کہ مصوری کو قرار دیا جاتا ہے- دیگر فنون میں غلطی کی گنجائش موجود ہوتی ہے جبکہ مصوری میں اگر ذرا بھی قلم غلط اٹھ جائے تو تصویر پھر حسرت کے رنگ یا رنج و ملال میں بدل جاتی ہے۔ غرضیکہ مصوری وہ فن ہے جو قلم کی گردش سے بوڑھا جوان اور جوان بوڑھا کر دیتا ہے-

سہ ماہی ادبیات میں مصوری کے ضمن میں شائع ہونے والے منتخب مضامین یہ ہیں: "خیال کے رنگوں کا شہر" از طارق شاہد (شمارہ ۵۲، ۲۰۰۰ء)، "آفتاب اقبال" از انجم جاوید (شمارہ۔ ۱۰۲، ۲۰۱۲ء)، "وصی حیدر کی مصوری" از انجم جاوید (شمارہ ۹۷، ۲۰۱۲ء)، "مخدوم صادق حسین ایک تصوراتی وجود" از حمزہ ابنِ وصی (شمارہ ۱۲۶، ۱۲۷، ۲۰۲۰ء)، "چترا پریتم" از حمزہ حیدر (شمارہ ۹۸، ۲۰۱۳ء)، "سر ورق کا مصور" از عباس شاہ (شمارہ ۱۰۲، ۲۰۱۲ء))، "استاد اللہ بخش" از شفقت علی جاوید (شمارہ ۲۰۱۳، ۱۰۴ء)، "عباس شاہ ایک آرٹسٹ "از محبوب عزمی(شمارہ ۱۰۱، ۲۰۱۴ء)،۔ مذکورہ مضامین کے مطالعے و تجزیے سے یہ بات اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ مضمون نگاروں نے فنِ مصوری پر مضمون لکھتے ہوئے مذکورہ فن کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں اور ان کے اثرات کی وسعت کو ملحوظ رکھا ہے۔

۳۔ مصوری کی روایت کے مضامین:

مصوری کی تاریخ بہت پرانی ہے- مصر، چین، ایران ، سپین و فرانس ، یونان وہ ممالک ہیں جن میں مصوری کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس فن کے اولین نقوش غاروں میں ملے ہیں اور ان نقوش کی دریافت بہت زیادہ پرانی نہیں بلکہ پچھلے سو سال کی ہی بات ہے یہ غار زیادہ تر فرانس اور سپین کے دیہات میں پائے جاتے ہیں جو کہ لوگوں کی رہائش کے لیے بنائے گئے تھے- آغاز میں مصور پیلا اور سرخ رنگ، کالے رنگ کے ساتھ استعمال کیا کرتا تھا- کالا رنگ اسے ان چراغوں سے مل جایا کرتا تھا جو غاروں کو روشن کیا کرتے تھے- یہی مختلف رنگوں کا

امتزاج ابتدائی مصوری میں جادوئی رنگ بھر دیتا ہے- وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان رنگوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا- بعد ازاں مغل حکمرانوں نے بھی مصوری کے فن کو پھیلانے اور نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا- اور تصویر کشی نے ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کر لی- علم و فنون کے ہر شعبے میں منفرد اور زمانے کے لحاظ سے مختلف اور جدید تکنیکیں دکھائی دیتی ہیں وہیں فنِ مصوری میں بھی نت نئی بے شمار جہتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ تصویر کو بنانے کے کئی رخ ہیں جیسے آواز کی تصویر، سماعی تصویر، خیالی تصویر وغیرہ- آنکھوں کو جو چیز بھلی معلوم ہوتی ہے یا کانوں میں جو آواز رس گھولتی ہے اس کا ایک نقشہ دماغ میں بن جاتا ہے- یا جس انداز میں کسی بھی منظر یا واقعہ کو بیان کیا جاتا ہے اس کی تصویر اسی انداز میں دماغ میں موجود رہتی ہے۔ اگر کہانی کو سرسری انداز میں بیان کیا جائے گا تو تصویر بھی دھندلی اور غیر واضح ہو گی-- اس کے برعکس اگر کہانی کی وضاحت مفصل انداز میں کی جائے گی تو تصویر بھی اتنی ہی جاندار اور دلکش بنے گی- جب کوئی بھی کہانی یا واقعہ کسی مصور یا فنکار کے سامنے بیان کیا جاتا ہے تو جیسے جیسے الفاظ مصور کی سماعت سے ٹکراتے ہیں ان کا ایک خاکہ اس کے ذہن میں ترتیب پاتا ہے جو کہ بعد میں ایک خوبصورت تصویر کا روپ دھار لیتا ہے- خیالات و واقعات کو تصویر کا روپ دینے کا مقصد انسانی شخصیت کا جمالیاتی پہلو ہے اسی جمالیاتی ذوق کی وجہ سے انسان تصورات کو تصویر کا روپ دیتا ہے۔

انسان کی زندگی جمالیات کے بغیر کچھ بھی نہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ خود خوبصورتی کو پسند کرتا ہے- یہی وجہ ہے کہ یہ خوبصورت دنیا تخلیق ہو چکی ہے- حسِ جمال جیسی نعمت سے صرف انسان کو نوازا گیا- دوسری تمام مخلوقات اس صفت سے عاری ہیں- یہاں اس پہلو سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حسن کو ماپنے کا کوئی آلہ نہیں بلکہ حسن ہمیشہ دیکھنے والی کی نظر میں ہوتا ہے- جو کہ فائدہ، نقصان سے بالاتر ہوتا ہے- مثلاً اگر ایک مصور ایک تصویر اس خیال سے بناتا ہے کہ وہ اسے بیچ کر پیسہ حاصل کرے گا تو شاید وہ اتنی خوبصورت تصویر نہ بنا سکے جتنا کہ وہ اسے اپنی مسرت و انبساط کے لیے بناتا تو وہ خوبصورت بنتی۔ فنونِ لطیفہ میں جمالیاتی رویہ کے علاوہ اگر کسی اور فائدے یا مقصد کو زیرِ غور رکھا جائے تو یہ کبھی میں صحیح معنوں حظ اٹھانے کا سبب نہیں بنے گا اس لیے ایک فن کار کے لیے اس کے فن میں غیر جانبداری بہت ضروری ہے۔

آج کے دور میں جب ہر طرف بھوک اور دولت کی ہوس کا راج ہے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ فنونِ لطیفہ کو فروغ دیا جائے تا کہ لوگ فرصت کے لمحات کو اچھے اور معیاری انداز میں گزار سکیں-- اس مقصد

کے لیے سرکاری و نجی ادبی رسائل اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ان رسائل نے مصوری کے شاندار ماضی کو لوگوں کے سامنے رکھنے میں اہم کردار ادا کیااور اس متعلق لوگوں کی مذہبی اور غیر مذہبی رائے کا احترام کرتے ہوئے ایسے مضامین شائع کئے کہ لوگوں کے دلوں میں موجود شکوک وشبہات کو ختم کرکے ان کو اس فن سے آگاہی دی ۔"ادبیات سہ ماہی" نے اس سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور مصور اور مصوری کے دھندلے عکس کو واضح کر نے کے لیے باقاعدہ طور پر ادبیات سہ ماہی میں فنونِ لطیفہ کے لیے گوشہ مختص کیا گیا تاکہ ماضی میں عوام وخواص کے مقبول فن مصوری سے لوگوں کو دوبارہ آگاہی دی جاسکے۔اور اسلام میں موجود مصوری کے درست تصور کو عوام تک پہنچایا جاسکے اس ضمن میں مختلف اوقات میں ادبیات سہ ماہی کے مختلف شماروں میں مصوری کی تاریخ، اسکا ماضی، حال اور مستقبل اور مشہور مصوروں کے متعلق مضامین شامل کیے جاتے رہے تاکہ مختلف طبقے اور مختلف علمی استعداد رکھنے والے لوگ یکساں طور پر اس فن سے آگاہی حاصل کرسکیں۔اس ضمن میں ادبیات کے شمارہ نمبر اکیاون۔باون میں ایک مضمون تحریر کیا گیا جس کا عنوان "خیال کے رنگوں کا شہر" مصنف طارق شاہد نے بڑے عمدہ طریقے سے مصوری کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

> "کینوس پر مختلف رنگ بکھیر دینا یا برش پکڑ کر رنگوں کی آڑھی ترچھی لکیریں بنانا آرٹ نہیں۔فنِ مصوری ایک قدیم فن ہے اور اس کی کئی جہتیں ہیں اس میں رنگ کا استعمال و چناؤ، برش کے اسٹروک اور خیال کو خاصے زاویے سے کینوس پر منتقل کرنا ہے۔ہر مصور اپنے احساسات کو برش کے ذریعے رنگوں کی صورت کینوس پر اتارتا ہے۔اور اس تخلیق کے مختلف زاویے بنتے چلے جاتے ہیں۔"[1]

تخلیق کرنا ایک خداداد صلاحیت ہے۔جو کہ ہر کسی کو عطا نہیں کی جاتی مگر کسی بھی فن کو جلا بخشنے کے لیے مسلسل محنت اور لگن بہت ضروری ہے۔مختلف شعبہ فن کی طرح فنِ مصوری میں بھی مختلف مصوروں نے معاشرے کی تلخ حقیقتوں اور اپنی ثقافت کو اجاگر کیا ہے اور ایسی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جو معاشرتی بگاڑ کا سبب بن رہی ہوتی ہیں۔ماحول کی گھٹن، دوہرے اقدار اور معاشرتی ٹوٹ پھوڑ کو اپنے اندر سے کینوس پر بکھیرنا ایک مصور یا تخلیق کار کا اثاثہ ہے۔تصویر سازی محض خوبصورت رنگ بکھیرنے کا نام ہی نہیں بلکہ اس کو عمل کے ذریعے بامقصد بنا کر معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنایا جانا چاہیے۔

جب ہم جمالیات کا مصوری کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں خوبصورتی کو عام معنوں میں بیان نہیں کیا جارہا ہوتا بلکہ اس کی وضاحت گہرے اور بلیغ مضمون میں کی جارہی ہوتی ہے- جیسے کسی شاعر نے کہا حسن سچائی ہے اور سچائی حسن ہے۔ ایک فنکار جب کوئی بھی ایسی تصویر بناتا ہے جو کہ دیکھنے میں بھلی معلوم نہ ہو یا کسی غریب یا خستہ حال انسان کی تصویر جو کہ انتہائی بد صورت ہو اس کے باوجود ہم اسے مکمل تصویر ہی کہیں گے کیونکہ وہ تصویر معاشرے کے تلخ پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے- ہمیں تصویر کی سچائی سے آگاہی کے بعد ہی اس کے عیب و بدصورتی مکمل اور بے عیب دکھائی دینے لگتی ہے- زندگی کے تلخ رویوں کو کبھی بھی خوبصورت نہیں کہا جاسکتا لیکن فن کے پسِ منظر میں وہ ہمارے لیے خوشی کا باعث بنتے ہیں- یعنی کہ ہر چیز اندر موجود قطعیت کی بناء پر اپنی قوت کا لوہا منوا لیتی ہے۔

مصوری اپنے معنی زندگی سے لیتی ہے اور روز مرہ زندگی میں بھی مصوری کی اہمیت سے کسی طور انکار ممکن نہیں۔ کیونکہ زندگی بھی مصوری کو معنی دیتی ہے- اس کی وضاحت دو طریقوں سے کی جاسکتی ہے- اول مصوری زندگی کے وجود کا پتہ دیتی ہے دوم وہ زندگی کے وجود کی وجوہات کا پتہ دیتی ہے- مصوری صرف کوئی لائن یا نقطہ نہیں بلکہ کسی مصور کی تخلیق میں ان کہی بہت سی باتیں، ان دیکھی دنیا، امیدیں، خواب، غم اور خوشیاں موجود ہوتی ہیں- مصوری صرف رنگ و روشنی کا امتزاج نہیں کہ اس کی مثال زبان سیکھنے کی سی ہے پہلے انسان الفاظ سے واقفیت حاصل کرتا ہے پھر اس کو بولتا اور تحریر کرتا ہے- مگر ہزار بولنے والوں میں کوئی ایک ایسا ہوتا ہے جو اس زبان میں شعر کہہ سکے اسی طرح مصوری بھی ان تمام بنیادی اصولوں کے بعد کا فنِ لطیف ہے- جس طرح ہر لفظ لکھنے والا شاعر نہیں ہوتا، ہر کہانی لکھنے والا افسانہ یا ناول نگار نہیں ہوتا اسی طرح صرف رنگ بکھیرنے سے تصویر نہیں بن جاتی بلکہ اس میں خیال اور فکر کا گہرا عمل دخل ہوتا ہے- اصل مصور وہی ہوتا ہے جو کہ اپنی تصویر میں ایسے رنگ لائے کہ وہ زندگی کے حقیقی رنگوں کی نمائندہ ہو نیز معاشرتی حقیقتوں کا صحیح ادراک بھی کر سکے۔ اس ضمن میں ادبیات کے شمارہ نمبر اکیاون۔ باون میں ایک مضمون تحریر کیا گیا جس کا عنوان "خیال کے رنگوں کا شہر" مصنف طارق شاہد نے بڑے عمدہ طریقے سے مصوری کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

"مسائل کو محدود کینوس پر لانا ایک مشکل عمل ہے- اس میں ذہنی اپروچ۔ کرافٹ اور فکر کو ہم آہنگ کر کے مؤثر طریقے سے پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے- مصوری میں کرافٹ کی

اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ذہنی اپج فلسفہ اور فکر کے بغیر کوئی مؤثر تخلیق عمل میں آ
بھی نہیں سکتی۔ سوچ اور فکر کے ساتھ ساتھ مصور رنگوں کو کینوس پر پینٹ کرے گا تو اسے
ابدیت حاصل ہو گی اور با معنی فن پارہ تخلیق ہو گا"[۲]

فن کوئی بھی ہو اسے ہر قسم کے مذہبی و لسانی تعصبات سے پاک ہونا چاہیے۔ گویا فن ایسا ہونا چاہیے جو ہر قسم کی تفریق سے پاک ہو جو کہ نہ صرف جمالیاتی احساس کو تسکین دے بلکہ روح کی بالیدگی کا ذریعہ بھی ہو۔ اس ضمن میں ادبیات کے شمارہ نمبر اکیاون۔ باون میں ایک مضمون تحریر کیا گیا جس کا عنوان "خیال کے رنگوں کا شہر" مصنف طارق شاہد نے بڑے عمدہ طریقے سے مصوری کے علمی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

"مصور در اصل اپنے معاشرے میں موجود حقائق کی عکاسی کرتا ہے- در حقیقت مصور اپنے
معاشرے کی تصویر ہوتا ہے- پھر اس تصویر سے کئی تصویریں امنڈ کر تحریک کی صورت
اختیار کرتی چلی جاتی ہیں-"[۳]

مصوری ایک ایسا فن ہے جو اظہار اور روح کی جسمانی و روحانی تخلیقی صلاحیتوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے- نیز معاشرتی سوچ اور پہچان کو نکھارتا ہے۔

۳۔ شخصیتِ مصور پر مضامین:

مصوری کے فن سے لگاؤ رکھنے والوں کے لئے ہر زمانے میں بنے ہوئے نقش و نگار اور اس سے جڑے دلچسپ واقعات کو جاننا ایک دلچسپ، منفرد اور مزے دار پہلو ہے- یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان نے تصویر بنانا کس سے سیکھا؟ قدرت سے یا سامانِ قدرت سے ؟

سامانِ قدرت نظروں کے سامنے تھا اور اس کا منہ بولتا ثبوت انسان خود ہے لہذا اس کا آنکھوں اور دماغ کو استعمال کرتے ہوئے تصویر بنالینا ایک فطری عمل تھا- مشاہدات اور قدرت کی رنگینوں کو دیکھنے کے بعد دماغ میں مختلف طرح کے عکس بننا شروع ہوئے اور یہی عکس انسان کی سوچ کو تصویر کشی کی طرف لانے کا باعث بنے۔ یہ عکس اس کی سوچ سے نکل کر کینوس پر ظاہر ہوئے آغاز میں انسان نے موجودات کی تصاویر کو اپنے قلم کا حصہ بنایا پھر خیالی تصاویر بھی بنائیں اور یہی تصاویر آہستہ آہستہ انسان کو مصوری کے میدان میں لے آئیں اور دنیا کے عظیم مصوروں کے وجود میں آنے کا باعث بنیں- دنیائے ادب کے معماروں کو ان عظیم ہستیوں کے کارناموں

سے آگاہ کرنے کے لیے "سہ ماہی ادبیات" نے اہم کردار ادا کیا-ان میں پہلا نام "آفتابِ ظفر" کا لیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ مشرق و مغرب کے عظیم ادیبوں اور فرض شناسوں نے آفتابِ ظفر کی عظمت کا اعتراف کیا ہے-جو کہ دنیا میں امر ہو جانے والی شخصیتوں کا عظیم مصور تھا- جو اپنے تخیل سے آرٹ کی نئی دنیا بسائے ہوئے تھا- قدیم یونانی اور ایرانی فن پاروں میں ظفر کی نقش نگاری میں قدرے مماثلت دکھائی دیتی ہے- یہ ایک منفرد جمالیاتی کارنامہ ہے جو انسان کو تخیل میں حسین اور حیرت انگیز دنیا کی سیر کرواتا ہے اور یہ تمام خوبیاں آفتابِ ظفر کے فن پاروں میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ انجم جاوید اپنے مضمون "آفتاب اقبال" میں لکھتے ہیں:

> "ان کے کام کو مکمل دیکھنے کے بعد یہ احساسِ شدت سے ہوتا ہے کہ اس کی ساری سوچیں، سارے تخلیقِ عمل ایک مخصوص دائرے کے اندر رقص کرتے نظر آتے ہیں-یہ دائرہ اسلامی تعلیمات، صوفیائے کرام اور انبیاء کے پیغامات کو تصویری شکل میں آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ پاکستان کی تاریخ و ثقافت، رسم و رواج اور تہوار کی تصویری شکل تراشی ہے-"[۴]

آفتابِ ظفر نے فنون کے ضمن میں بے مثال خدمات سرانجام دی ہیں-ان کا کام نصف صدی پر بے شمار سمتوں میں پھیلا ہوا ہے جو کہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے- مصوری کے ضمن میں منفرد کام ہی آج بھی ان کو دنیائے فنون میں زندہ رکھے ہوئے ہے- انجم جاوید اپنے مضمون "آفتاب اقبال" میں لکھتے ہیں:

> "ان کا کمال فن یہ ہے کہ ان کا کام دور سے ہی پہچان لیا جاتا ہے- آفتاب ظفر اس کارِ ہنر میں یکتا ہیں کہ انہیں کس تناسب سے کینوس پر رنگوں کے امتزاج کو بکھیرنا ہے-ضرورتاً ہلکے، ضرورتاً گہرے رنگوں کا دلکش و برمحل استعمال ان کی پینٹنگز کو جلا بخشتا ہے--- ظفر نے نظریاتی ذہن اور موضوعاتی فکر کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا- مسلمانوں کی تاریخ ان کا شاہانہ عروج پھر زوال، قرآنی آیات و تعلیمات--- پاکستان کے مختلف صوبوں میں رہنے والوں کے رسم و رواج، لباس، زیورات، خوشی اور غمی کے مواقع پر پائی جانے والی کیفیات، مذہبی تہوار، پاکستان کی اہم عمارات، کیلی گرافی اور کسی حد تک نیوز آرٹ کے ساتھ مسلم ہیروز کی سیریز میں بیس تصاویر ان کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہیں-"[۵]

اگر آج مغل بادشاہ شاہ جہاں اور اکبر کے دور کا ہندوستان ہوتا تو آفتاب ظفر اپنے مشرقی خیالات اور فنی کمالات کے حوالے سے کوئی نیا ہی جہان آباد کر چکا ہوتا اور یہ دنیا اس قدر دلفریب و دلکش ہوتی کہ دیکھنے والا دنگ رہ جاتا۔ عبد الرحمن چغتائی اکثر کہا کرتے تھے:

"آرٹ ایک عظیم روح کی تخلیقی قوت کا نام ہے آرٹسٹ پیغمبر ہے جو اپنے انداز میں پیغمبری کرتا ہے۔ وہ جب ہاتھ اوپر اٹھاتا ہے تو اس کی انگلیاں ستاروں کو چھونے لگتی ہیں۔ آسمانوں کی ساری رفعتیں اس کی روح میں اتر جاتی ہیں۔"[۶]

آفتاب ظفر کی عظمت کا راز وجدان اور ذوق کی صفات سے مالا مال تھا اور یہی ایک فنکار کی وہ صلاحیت ہے۔ جیسے اقبال نے "خون جگر" کے نام سے موسوم کیا۔ آفتاب ظفر کے فن میں مشرقی اقدار و روایات کی واضح جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کی مصوری میں مختلف طرح کے جمالیاتی عکس دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے فن سے تہذیب و ثقافت، معاشرتی رہن سہن اور زندگی کی بے ثباتی کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ آنے والی نسلیں ہندوستانی آرٹ کی روح کی سب سے بڑے نمائندے کی حیثیت سے یاد رکھیں گی۔

آفتابِ ظفر کے بعد مصوری کی دنیا کا دوسرا بڑا نام "وصی حیدر" ہے۔ مصوری، نقاشی، خطاطی اور شاعری کے حوالے سے وصی حیدر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کی مسلسل محنت کوشش اور لگن نے ان کے کام کو دنیا کے مایہ ناز فنکاروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ انہوں نے نہ صرف قرآنی آیات اور اسلامی خطاطی پر مبنی حیرت زدہ اسکیچز اور پورٹریٹس بنائے بلکہ اس کے علاوہ بے شمار پینٹنگز اور فن پارے تخلیق کر کے اسلامی آرٹ پر ناقابلِ فراموش نقوش چھوڑے۔ انجم جاوید اپنے مضمون "وصی حیدر کی مصوری" میں لکھتے ہیں:

"وصی حیدر کا جتنا بھی کام میرے سامنے آیا اس پس منظر میں، میں اسے ایک ایسا مصور کہہ سکتا ہوں جس نے مصورانہ میدان میں لچک دار رویے کو اپناتے ہوئے اپنے کینوس کے دروازے ہر سوچ، ہر فکر، ہر زاویے کے لیے آزاد چھوڑ دیے اور جو بھی خیال اس کینوس پر آ کر ٹھہرا وصی نے اسے حسبِ ضرورت رنگوں کے حصار میں جکڑ کر قید کر لیا۔ وصی کے ذہن میں روشیانہ مستانہ روی کی لہریں کسی پارے کی صورت تھرتھرائی رہتی ہیں۔ وہ اپنی بے تاب

و بے ترتیب لہروں کو رنگوں اور برش کا سہارا دے کر کینوس پر منتقل کرنے کو بے تاب و مضطرب رہتا ہے۔"[۷]

جان کیٹس نے ۲۸ سال کی عمر میں دنیائے فن کی عظیم تخلیقات کیں۔ کلیساؤں میں مصوری کرتے ہوئے اینجلا مائیکل کی عمر گزری۔ سکندر، اعظم نے ۳۲ سال کی عمر میں آدھی دنیا فتح کرلی یہی الفاظ فنِ مصوری کے عظیم نام وصی حیدر کے لیے بھی کہے جاسکتے ہیں۔-جن کے ہاتھ ہمہ وقت اپنی مصوری اور خطاطی میں چلتے رہے اور ایسی نایاب اور دلکش فن پارے بنائے کہ بلاشبہ ان کے بغیر فن کی تاریخ نامکمل تصور کی جاتی۔ انجم جاوید اپنے مضمون "وصی حیدر کی مصوری" میں رقمطراز ہیں:

"مصوری میں ڈکشن ایک مشکل امر ہے تاہم چغتائی، جمیل نقش، اقبال مہدی، صادقین گل جی کی طرح وصی حیدر نے اپنی پینٹنگز کو ایک مخصوص استعارہ "دائرہ" دے کر ڈکشن قائم کرنے کی سعی کی- Time and Space کا موضوع دے کر وصی نے دائرہ بنا کر جو پینٹنگز بنائیں میرے خیال میں یہ پہلا قدم تھا جہاں سے وصی کی مصورانہ شناخت بننے کا عمل شروع ہوا۔۔۔ مفکرین کی نظر میں ہمیشہ دائرہ اہم رہا۔۔۔ وصی حیدر کی پینٹگز میں ایک اور نمایاں جز اورنج کلر کا استعمال ہے۔ دانستہ اور غیر دانستہ طور پر استعمال ہونے والے دونوں جز زندگی اور موت، آغازِ سفر اور ااختتامِ سفر کی علامات ہیں۔"[۸]

وہ ایک ایسے فطری مصور تھے جنہوں نے اپنے فن کو نکھارنے کے لیے اس میں بے شمار اختراعات کیں جو حقیقت اور سچائی کا احساس دلاتی تھیں۔ جس کا خیال آفاقی محبت کے لمس کی طرح تھا۔ آغاز میں ان کے فن پاروں مین پبلو پکاسو کے فن کی نمایاں جھلک دکھائی دی بعد ازاں فرانس، یونان اور یورپ کے عظیم مصوروں کے اثرات نمایاں رہے۔ مگر یہ اثرات بھی دیرپا ثابت نہ ہوئے پھر انہوں نے اپنی تخلیقی سوچ اور فنی خوبیوں کو استعمال میں لاکر جدید اسلامی فنون اور قرآنی خطاطی میں اپنا نام پیدا کیا۔ مسلسل محنت اور کوشش سے ان فنون میں وہ منفرد مقام حاصل کیا کہ آنے والی دنیا ان کے شاہکاروں کی وجہ سے انہیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔ انجم جاوید اپنے مضمون "وصی حیدر کی مصوری" میں لکھتے ہیں:

"وصی حیدر کے ہاں ورائٹی کی کمی نہیں اس نے مختلف پہلوؤں اور مختلف خطوط پر کام کیا اور نہایت حساس رہ کر کینوس پر رنگوں کو برتا۔ تاہم ان کی بیشتر پینٹگز میں تیز رنگوں کا استعمال

نظر آتا ہے۔ حدت آمیز رنگ گویا ان کی شخصیت کا پرتو ہوں۔وصی حیدر نے اسٹیرک آرٹ،،ماماسوتر، پورٹریٹ فیگر یٹو آرٹ سمیت مختلف جہتوں میں اپنی صلاحیتوں کو آزمایا۔ ۔۔وصی حیدر نے فیگر یٹو آرٹ میں ذاتی تجربے کیے جو کہ دیکھنے کے قابل ہیں۔"[۹]

الغرض وصی حیدر کا سارا کام جلال و جمال کا حسین امتزاج ہے جو کہ لطافتِ احساس اور اعلیٰ تخلیقی شعور کی منہ بولتی تصویر ہے۔ فن کے رستے پر رواں دواں وصی حیدر فن برائے زندگی کی منزل پر پہنچا اور یہی مقام وصی حیدر کے فن کی تکمیلی منزل تھا۔

انسانی حسن اور قدرتی مناظر کو کینوس پر اتارنے والے شہرت یافتہ مصور مخدوم صادق خان اپنی ذات میں ایک عہد تھے۔وہ حسن پرست مصور تھے۔ان کے فن پاروں میں قدرتی مناظر کا حسن اور عورت کی جھلک نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ ان کا قدرت پر یقین بہت گہرا تھا۔وہ یہ قدرتی حسن کو بنانے والے کے حسن کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اتنا حسن مافوق الفطرت ہستی ہی تخلیق کر سکتی ہے۔صادق خان کو عام مصوری کے علاوہ تجریدی مصوری میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ان کا آرٹ منفرد ہونے کے باعث ان کی شخصیت کو اعلیٰ مقام عطا کرتا ہے۔حمزہ ابنِ وصی اپنے مضمون "مخدوم صادق حسین ایک تصوراتی وجود" میں مصوری کی جمالیاتی اقدار کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"مخدوم صادق خان پاکستان کے ان مصوروں میں سے ہیں جو اپنے فن پاروں کی مختلف طرز کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کا فن وجود کو لے کر رنگوں کے ذریعے سے اپنا سفر غیر معمولی انداز میں طے کر رہا ہے۔کئی فن پاروں میں رنگوں کا زیادہ استعمال ان کے اندر کے اضطراب کو ظاہر کرتا ہے۔ تجریدیت کا ایک منفرد انداز ان کے فن پاروں کو انفرادیت بخشتا ہے۔ان کے فن پاروں میں موجود عمارتیں اور منجمد رنگ ان کی سوچ کی اختراع ہیں یعنی وہ دنیا جس میں گم ہو جانا ان کا وطیرہ ہے۔"[۱۰]

مخدوم صادق خان ، شاداب وادیوں اور باغوں کے رنگ برنگ پھولوں کے خوبصورت ماحول کا مصور تھا۔مگر حالات وواقعات نے اسے مافوق الحقیقت نقاشی کا فنکار بنادیا۔نقادانِ فن نے فنون کو "زندگی کا عکس" قرار دیا ہے۔ آرٹ چاہے کسی بھی فن کار کا ہو وہ ایک نئی شمع کی مانند ہے جس کی روشنی سے لوگ استفادہ ضرور کرتے ہیں۔ چترا پریتم کا شمار ایسے مصوروں میں ہوتا ہے جنھوں نے مصوری اور خطاطی کے امتزاج سے اپنا اسلوب واضح

کیا۔ وہ ایک طرف اسلامی خطاطی و مصوری سے استفادہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف دیگر مذاہب کے نقوش بھی ان کی مصوری اور خطاطی میں نمایاں دیکھائی دیتے ہیں۔ حمزہ حیدر اپنے مضمون "چترا پریتم" میں لکھتے ہیں:

"ان کے اسٹائل سے یوں لگتا ہے جیسے گاؤں کی کامیاب مفلسی انسانوں کی خود غرضی امیری کو تھپڑ مارتے ہوئے اپنے وجود کو ہمیشہ کا ساتھی بنا دینا چاہتی ہے- رنگوں کی آمیزش اور ان کا منظم انداز ہر موم دل کو مزید پگھلا دیتا ہے- ان کے نظریات سے لبریز رنگ اور مطبوعہ نفوس جدھر جدھر سسکیاں بھرتے ہیں- چترا پریتم صاحب نے ان کناروں کو (جو خود بے کنارہ ہیں) بھرپور انداز میں پیش کیا- غائبانہ معاملات اور ان دیکھی خراشیں جو خوشی میں خوش اور غم میں آبِ استادہ کی مانند قائم و دائم ہیں۔ چترا صاحب کی پینٹنگز میں پکڑم پکڑائی میں مصروف دکھائی دیتی ہے-"[۱۱]

مصور کو معاشرے میں حساس ترین انسان کی حیثیت سے مانا جاتا ہے- قدرتی حسن اسے پرکشش معلوم ہوتا ہے- اسے قدرتی مناظر لبھاتے ہیں کبھی بہتا دریا اسے کوئی نغمہ سناتا ہے تو کبھی بانسری کی دھن زندگی کی پکار معلوم ہوتی ہے تو کبھی برستی بارش اسے انجان راہوں کا مسافر بنا دیتی ہے تو کبھی خشک صحرا اس کے لیے امید کی کرن ثابت ہوتا ہے- چترا پریتم کو نہ مصوری کے لیے درسگاہ میسر تھی اور نہ ماحول- مگر اس کے باوجود ان کی ذات میں چھپا مصور ان کی دلی خواہشات اور رنگین دنیا آباد کرنے کے لیے بے چین کیے رکھتا اور اسی بے چینی نے غریب دیہات سے تعلق رکھنے والے چترا پریتم کو اعلیٰ پائے کا مصور اور خطاط بنا دیا جو کہ زندگی کی حقیقتوں کو کینوس کے ذریعے لوگوں تک پہنچاتا تھا۔ حمزہ حیدر اپنے مضمون "چترا پریتم" میں چترا پریتم کی مصوری کے جمالیاتی پہلوؤں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چترا صاحب کی پینٹنگز دراصل زندگی کے وہ رنگ ہیں جنھوں نے اپنے اندر بچپن، جذباتی وابستگی سے حقیقت و فلاح کا راستہ سمو رکھا ہے۔۔۔ ان کے لائٹ موڈ میں رنگے فن پاروں نے سب چاہنے والوں کو اپنی پینٹنگز کی طرف کھینچ رکھا ہے کوئی چاہنے والا کسی مسئلے کو تکتا ہے۔ کوئی کسی چھاؤں کی دہلیز پر سر سجائے ہے۔ کوئی خدا سے مل رہا ہے تو کوئی آیتوں کے حصوں میں ڈوبا حیران و پریشان ہے-"[۱۲]

چترا پریتم صاحب کی مصوری میں جمیل نقش کی جھلک واضح دکھائی دیتی ہے-انہوں نے ایک کامیاب مصور اور خطاط کی حیثیت سے خود کو منوایا-انجم ایوب کا شمار پاکستان کے نامور مصورین میں ہوتا ہے-انہوں نے اپنی مصورانہ زندگی میں نیلے آسمان، ساون کے سیاہ بادل، شاداب میدانوں، رنگین بہاروں اور خوبصورت وادیوں پر مبنی بے شمار پینٹنگز اور فن پارے تخلیق کیے-وہ ایک باشعور، ذمہ دار اور حساس ہنر مند مصورہ ہیں۔انہوں نے رنگوں کے ذریعے معاشرے کے حساس پہلوؤں کو کینوس پر بکھیرا تاکہ ان کا فن معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بن سکے۔انجم ایوب کا شمار ان مصورین میں ہوتا ہے جو مصوری کو خانہ آرائش کار نہیں سمجھتے بلکہ اس سے ماوراز ندگی سے بھرپور فن قرار دیتے ہیں۔اس ضمن میں ادبیات کے شمارہ نمبر اکیاون۔باون میں ایک مضمون تحریر کیا گیا جس کا عنوان "خیال کے رنگوں کا شہر "مصنف طارق شاہد نے بڑے عمدہ طریقے سے مصوری کی جمالیاتی اقدار پر روشنی ڈالی ہے۔

> "انجم ایوب کے نزدیک مصوری کی کسی بھی صنف سے تعلق رکھنے والا فن پارہ محض مصور یا ناظر کے ذوقِ جمال کی تسکین کا ذریعہ نہیں ہوتا۔جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں وہ لا محدود امکانات کے حامل فن کو محدود اور پابند کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جس طرح شعر، افسانہ یا ناول محض الفاظ کا کمال نہیں ہوتا بلکہ الفاظ سے پہلے کسی خیال، پیغام اور تحریک کی ترسیل مطلوب ہوتی ہے اسی طرح مصوری محض رنگوں کی قوسِ قزح نہیں بلکہ رنگ تو محض ذریعہ ہیں اصل مقصد کو دیکھنے والے کے ساتھ فن کا اپنے شعور و آگاہی، تعلیم و تحریک اور ذوقِ جمال کو Share کرتا ہے۔"[۱۳]

کسی حد تک یہ حقیقت بھی ہے کہ مصور بھی معاشرے کا حساس ترین شخص ہوتا ہے۔وہ اپنے فہم کو رنگوں کی صورت میں لوگوں تک پہنچا کر نہ صرف ان کے حظ کا سامان پیدا کرتا ہے بلکہ اسی رنگ قزح کے ذریعے وہ معاشرتی مسائل کو حل کرنے کے لیے لوگوں کی ذہن سازی کرنے کے لیے بھی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ اس ضمن میں ادبیات کے شمارہ نمبر اکیاون۔باون میں ایک مضمون تحریر کیا گیا جس کا عنوان "خیال کے رنگوں کا شہر "مصنف طارق شاہد نے بڑے عمدہ طریقے سے مصوری کی جمالیاتی اقدار پر روشنی ڈالی ہے۔اس ضمن میں

ادبیات کے شمارہ نمبر اکیاون۔باون میں ایک مضمون تحریر کیا گیا جس کا عنوان "خیال کے رنگوں کا شہر" مصنف طارق شاہد نے بڑے عمدہ طریقے سے مصوری کی جمالیاتی اقدار پر روشنی ڈالی ہے:

"انجم ایوب بنیادی طور پر گرافک آرٹسٹ تھیں اور ایک گرافک آرٹسٹ اپنی تخلیق کے آغاز میں اپنے خیالات اور موضوعات کو کینوس پر منتقل کرتا ہے۔ گرافکس میں ایک فنکار کی حساسیت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ تخلیقی ترتیب کے اعتبار سے ہر پینٹ پر نمبر کا اندراج کرتا ہے۔ تاکہ ناظر یا ناقد اس کے فنی حسن اور باریکیوں سے مکمل واقفیت حاصل کر سکیں۔ اور اس پینٹنگ کو بنانے کا مقصد حاصل ہو سکے"[۱۴]

ادبیات میں جہاں ایک طرف مصوری کے فن کو اجاگر کرنے کے لیے مضامین شامل کیے گئے وہیں دوسری طرف اس فن میں مہارت حاصل کرنے والوں کو خراجِ تحسین پیش کر کے ان پرانے عہد کی عظیم شخصیات کو زندہ و جاوید بنا دیا۔ جنہوں نے اپنے فن اور تخلیق سے انسانوں اور فن سے محبت کرنا سکھائی۔ ان کے تخلیقی فن کا دارو مدار انسانیت اور انسان سے محبت تھا۔ انہوں نے اپنے فن کے ذریعے لوگوں کو ان کی اقدار، مذہب اور ثقافت سے اس وقت روشناس کروایا جب آرٹ اور مصوری کی ابتری کا زمانہ تھا۔ ادبیات میں اس ضمن میں ان عظیم مصوروں کے احوال، ان کے کارناموں کے صاف ستھرے معلوماتی مضامین اور تاثرات کو شائع کیا گیا۔ ان مضامین میں ان کی زندگیوں کے اہم اور نمایاں پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی اس ضمن میں مختلف لیجنڈ مصوروں مثلاً عبدالرحمٰن چغتائی، استاد حالی محمد اشرف، صادقین گل جی، چترا پریتم، راجہ روی،، مقبول فدا حسین اور دیگر کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ان لوگوں کی محنت اور کوشش نے مصوری کے مٹتے ہوئے نقش کو واضح کیا تاکہ لوگوں میں جمالیاتی شعور پیدا ہو اور وہ قدرت اور سامانِ قدرت حظ اٹھا سکیں۔

ب۔ موسیقی:

فنونِ لطیفہ میں موسیقی کو بلند ترین مقام حاصل ہے۔ موسیقی یا موسیقی کا شوق ایک قدرتی ولولہ ہے۔ نظام کائنات کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہر شے اپنے انداز اور رنگ میں گنگناتی دیکھائی دیتی ہے۔ آگ، ہوا، پانی ہر شے میں موسیقی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ ہر شے و ہستی اپنی ہی دھن میں مست گنگناتی دیکھائی دیتی ہے اور اپنی صدا پر خود ہی فدا دیکھائی دیتی ہے۔ جسطرح انسانی جذبات کا اظہار ایک طبعی کیفیت ہے اسی طرح گانا بھی ایک قدرتی

کیفیت ہے- جو کہ ہنسی اور غم دونوں کیفیتوں کا عکس ہے۔ بعض ماہرین نے موسیقی کو ریاضی کی اہم شاخ کہا ہے۔ ابنِ سینا کے بقول موسیقی کو ریاضی کے اہم علوم میں شمار کیا جاتا ہے -ریاضی کی اہم شاخ موسیقی میں سروں سے پیدا ہونے والی آواز کی پہچان کا ذکر ہوتا ہے -یعنی کہ آواز کو ایک خاص ترتیب اور منظم انداز میں نکالنے کا نام موسیقی ہے۔

موسیقی کی اہم اصناف گانا، بجانا، ناچنا اور شاعری ہیں۔ ارسطو کے بقول موسیقی کا سب سے اہم اور بنیادی جز گانا ہے۔ یعنی گانا موسیقی کے باقی تمام اجزاء کو بنیاد فراہم کرتا ہے یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ کہ باقی تمام علوم موسیقی گانے کی اہم شاخیں ہیں۔ گانے کی مثال تنے کی طرح ہے جیسے تنے کے بغیر درخت کا وجود نامکمل ہے اسی طرح گانے کے بغیر موسیقی کا وجود ناممکن ہے۔

سہ ماہی ادبیات میں موسیقی کے ضمن میں شائع ہونے والے منتخب مضامین یہ ہیں: "دھرپد سے غزل تک" از یاسر شاہ (شمارہ ۱۰۳، ۲۰۱۴ء)، ""کلاسیقی موسیقی میں گھرانوں کا نظام از" انعام ندیم " (شمارہ ۔۱۰۰، ۲۰۱۳ء)، "ریشماں" از انعام ندیم (شماراہ ۱۰۲، ۲۰۱۴ء)، جدید شناشاعری، گائیکی اور شنا کی مفلسی" از احمد سلیم سلیمی (شمارہ ،۱۲۵، ۲۰۲۰ء)، "ملکہ کافی زاہدہ پروین" از بدر الزماں (شمارہ ۱۰۲، ۲۰۱۴ء)، "نثار بزمی " از ڈاکٹر نثار ترابی (شمارہ،۱۰۰ ،۲۰۱۳) ،خواجہ خورشید انور " از عقیل عباس جعفری،(شمارہ،۹۸، ۲۰۱۲ء)،)، " مضامین موسیقی" از عقیل عباس جعفری (شمارہ ۔۱۰۰، ۲۰۱۳ء)،"موسیقی اور ہماری زندگی "از اختر آزاد (شمارہ ۹۶، ۲۰۱۲ء)،۔ مذکورہ مضامین کے مطالعے و تجزیے سے یہ بات اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ مضمون نگاروں نے فنِ موسیقی پر مضمون لکھتے ہوئے مذکورہ فن کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں اور ان کے اثرات کی وسعت کو ملحوظ رکھا ہے۔

ا۔ موسیقی کی روایت کے مضامین:

موسیقی کو روح کی غذا کہا جاتا ہے- جس طرح غذا کے بغیر انسان کا جینا مشکل ہو جاتا ہے اسی طرح موسیقی کے بغیر انسان کے جذبات و احساسات کا اظہار مشکل ہو جاتا ہے۔ موسیقی کا انسانی وجود کے ساتھ ایک قدرتی تعلق پایا جاتا ہے۔ انسان کے دماغ اور دل کا موسیقی سے تعلق مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس تعلق کے چار اہم اجزاء ہیں۔ جو کہ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اثر کی نوعیت کیا ہے؟

۱:	تخیلات کے ذریعے (یعنی کہ انسان کی فکر و دانش اور سوچنے سے متعلق)

۲:	سماعت کے ذریعے (یعنی کہ سماع (سننے) سے متعلق)

۳:	لمس کے ذریعے (چھونے سے متعلق)

۴:	بصارت کے ذریعے (یعنی دیکھنے سے)

انسان جب کچھ سنتا ہے تو اس سے متاثر ہوتا ہے وہ سنناکچھ اس کے لیے مسرت و انبساط کا ذریعہ بنتا ہے۔ تو کبھی رنج و ملال کا۔ انسان قدرتی طور پر خوبصورت آوازوں کا دلدادہ ہے۔ چونکہ موسیقی بھی آواز کی خوبصورتی کا دوسرا نام ہے جو کہ ایک خاص ترتیب اور تنظیم سے وجود میں آتی ہے۔ اس لیے انسان اور موسیقی میں ایک منفرد اور اٹوٹ نسبت ہے۔ ہر شخص چاہے وہ موسیقی کا شوقین ہو یا نہ ہو جب وہ خوبصورت آواز سنتا ہے تو اس سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ اور یہی شے اس کے حسن سے متاثر ہونے کی فطری صلاحیتوں کا عملی ثبوت ہے۔

انسان کی موسیقی سے دلچسپی کو بڑھانے اس میں جدت پیدا کرنے، لوگوں کو اس کے بنیادی لوازمات سے آگاہ کرنے میں اخبارات ورسائل نے اہم کردار ادا کیا۔ ان رسائل کی بدولت لوگوں کو فنونِ لطیفہ سے متعلق بنیادی اور اہم معلومات فراہم کی گئیں۔ اس مقصد کے لیے اکادمی ادبیات سے جاری ہونے والے سہ ماہی ادبیات نے گراں قدر خدمات سر انجام دیں۔ اور فنونِ لطیفہ کے لیے ایک گوشہ رکھا تاکہ لوگوں کو فنونِ لطیفہ سے متعلق معلومات مل سکیں اور ان کی جمالیاتی حس کی تسکین ہو سکے۔ موسیقی کو فنونِ لطیفہ میں اہم اور بنیادی مقام حاصل ہے۔

رسائل میں موسیقی اور دوسرے فنون کے مضامین کی اشاعت کا اہم مقصد جہاں لوگوں تک ان فنون سے متعلق شعور اور آگاہی ہے وہی اس کا دوسرا مقصد لوگوں کے جمالیاتی شعور کو بیدار کرنا ہے تاکہ وہ حسن اور اس کے لوازمات سے آگاہی حاصل کریں۔ موسیقی کو اگرچہ فنونِ لطیفہ کی اہم اقسام میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن بذاتِ خود بھی یہ ایک علم ہے جس میں گم ہو کر قدرت کے کرشمے دیکھے جاسکتے ہیں۔ موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ میں واضح فرق کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ شاعری، رقص یا مصوری میں ایک فنکار حسن و جمال کے جادو یا مناظر قدرت کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے لیکن ایک موسیقار اپنی ذات میں گم ہو کر دلی سکون حاصل کرتا ہے۔ کسی بھی فن کو پھیلانے اور عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے علمی اور عملی دونوں لحاظ سے مکمل واقفیت اور آگاہی

ضروری ہے۔ فنونِ لطیفہ میں موسیقی ایک ایسا فن ہے جس میں جامعیت اور مشکل پسندی سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ اور اس مشکل پسندی کو علمی اور عملی دونوں لحاظ سے سمجھنا ہی کسی فن کار کی بہترین صلاحیتوں کو نکھارتا ہے۔ موسیقی کے فنکار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ موسیقی کے علاوہ اس کے آلات سے بھی واقفیت حاصل ہو ۔ کیونکہ موسیقی کو آہنگ اور ترنم کا دوسرا نام کہا جاتا ہے۔ موسیقی کو سر کی پر مغز زبان کہا جاتا ہے یعنی کہ ایسی زبان جو ساز میں آکر کائنات کو اپنے حصار میں کرے اور اس حصار میں زندگی پر اس کا ایسا اثر پڑے کہ ہر سر کا ہر رنگ چاہے وہ منفی ہو یا مثبت ہلچل مچا کے رکھ دے۔ جب سر و تال ملتے ہیں تو ایسی خوبصورت تار جنم لیتی ہے جو ہمارے دل و دماغ میں کبھی خوشی کے رنگ گھول دیتی ہے تو کبھی اس کے زیرِ اثر ہماری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ موسیقی صرف ایک فن نہیں بلکہ ایک باقاعدہ اور مربوط علم کا نام ہے۔ اس کا تعلق انسان کی نفسیات سے ہوتا ہے۔ اس کی تخلیق میں جذبات، احساسات اور خیالات کر فرما ہوتے ہیں۔ اس کی تخلیق سماجی، جغرافیائی اور تہذیبی حالات سے متاثر ہوتی ہے۔ موسیقی کو مختلف اسالیب میں برتا جاتا ہے مثال کے طور پر، دھرپد، ٹپہ، خیال، غزل اور گیت وغیرہ۔ لیکن کسی بھی فن سے تسکین یا مسرت اسی وقت حاصل کی جاسکتی ہے جب اس فن کے اصول و ضوابط سے آگاہی کے لیے مسلمان راہنماؤں نے نمایاں کاوشیں کیں تاکہ موسیقی کی بجھتی ہوئی شمع کو دوبارہ روشن کیا جاسکے۔ یاسر اقبال "دھرپد سے غزل تک" میں موسیقی کے علمی پہلو کے متعلق رقم طراز ہیں:

> "فنونِ لطیفہ کے حوالے سے برصغیر کی ترقی مسلمان فاتحین کی مرہونِ منت رہی۔ عربی، ایرانی، تورانی اور ترک موسیقی کا مقامی موسیقی پر گہرا اثر پڑا اور نئی موسیقی وجود میں آئی جو اپنی اثر انگیزی کی بناء پر عوام میں مقبول ہونے لگی۔ اور درباروں کی سرپرستی میں ترویج و ترقی کے مدارج طے کرنے لگی۔"[۱۵]

برصغیر میں مسلمان فاتحین نے موسیقی کو باقاعدہ فن کی حیثیت سے متعارف کروایا اور اس متعلق موجود مذہبی خیالات کی درست تصویر کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس فن کو ہر قسم کی مذہبی قیودات سے آزاد کروایا۔ ماضی میں موسیقی کو صرف مذہبی گیتوں کی صورت میں پسند کیا جاتا تھا اور بعض مذاہب میں اس کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ مسلمان فاتحین نے آکر موسیقی کو مندروں، کلیساؤں اور گرجاگھروں سے باہر نکالا۔ اور عوام میں اس کی اشاعت کو باقاعدہ فن کے طور پر کروائی۔ اس سلسلے میں باقاعدہ ادارے اور

اصطلاحات متعارف کروائی گیئں۔ تاکہ عوام موسیقی کے اسالیب سے واقف ہو کر اس سے حظ اٹھا سکیں۔ موسیقی کی بات تو ایک غضب کی بات یہ بھی ہوتی ہے کہ آواز کی خوبصورت دھن پر تاثیر ہو اور متوازن ساز تو ان سب کے سامنے شاعری جتنی بھی اچھی اور باکمال ہو آواز اسے پردے کے پیچھے دبا کے رکھ دیتی ہے۔ آوازیں جو سر کے پیکروں میں ڈھل کر ذہن کے جمالیاتی دریچوں میں روشنی کی طرح پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ یہ نغمہ ہمارے ذہنوں پر کس طرح کے نقش ابھارتے ہیں؟ وہاں کیا تصویریں بنتی ہیں؟ اس مقصد کے لیے موسیقی کے علم کا حصول بہت ضروری ہے بد قسمتی سے موسیقی کی تعلیم صرف پیشہ ور لوگوں تک ہی محدود رہی۔ اور اس علم کو بہت کم کتابوں تک آنے دیا گیا۔ جس کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ موسیقی ایک ایسی زبان ہے جس کی کوئی لغت نہیں مگر اس میں کچھ علائم و نقوش ایسے ضرور موجود ہیں جن کے فہم سے سُر مختلف احساسات و جذبات میں ڈھل جاتی ہیں۔ یہ جذبات واحساسات سامعین پر اس کی جمالیاتی حس کے مطابق اثر انداز ہوتے ہیں، باذوق لوگ نغمے سے زیادہ محظوظ ہوتے۔ اس کے برعکس بے ذوق لوگ یا ایسے لوگ جن میں جمالیاتی ذوق نہ ہونے کے برابر ہو وہ موسیقی سے محظوظ بھی کم ہوتے ہیں۔ یاسر اقبال "دھرپد سے غزل تک" میں موسیقی کے علمی پہلو کے متعلق رقم طراز ہیں:

> "موسیقی ہماری فکر و سوچ میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ یہ ہمیں وجدانی کیفیت کے زیرِ اثر کچھ وقت ایسا مہیا کرتی ہے جو پُر لطف ہوتا ہے۔ جس کی لذت لازوال ہوتی ہے۔ جو کہ ہماری روح کو سرشار کر دیتی ہے۔ موسیقی میں سُر محض آواز کے اتار چڑھاؤ کا نام نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ ایک خوشبو، ایک رنگ، ایک درد ایک بوند، ایک لفظ اور بھی بہت کچھ ہے۔ یہ نہ تو کسی مصور کے کینوس کی طرح محدود ہے اور نہ ہی کسی مجسمہ ساز کے مجسمے کی طرح ایک شکل میں بلکہ اس کے رنگ ایک ساز میں بعض اوقات دنیا سمٹ آتی ہے یوں لگتا ہے جیسے ہر طرف قوسِ قزح کے رنگ بکھر گئے ہوں۔ موسیقی میں ہمہ گیر تخیل اور سُروں کی جلوہ گری کو اہم گردانا جاتا ہے۔ اگر غنائیت میں تخیل نہ ہو تو وہ بے کار ہے کیونکہ ہر فن میں بنیادی چیز حسنِ ترتیب ہے۔ اگر یہ ترتیب رنگوں کی ہو تو مصوری، الفاظ کی ہو تو شاعری اور آواز یا سُر کی ہو تو موسیقی ہو گی۔ موسیقی کی ترکیب میں پہلا اور بنیادی جز تخیل ہے اس کے بغیر موسیقی میں لطف نہیں رہتا۔"[۱۶]

بر صغیر کی کلاسیکی موسیقی ایک عظیم ثقافتی سرمایہ ہے۔ جیسے کلاسیکی موسیقی کو بر صغیر پاک و ہند میں پروان چڑھانے میں مسلمان بادشاہوں اور لوگوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہاں یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ کلاسیکی موسیقی کا بیج بر صغیر میں مسلمان فاتحین کی وجہ سے پھل پھول کر پروان چڑھا۔ مگر آج کلاسیکی موسیقی اور ہماری عوام کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا ہے۔ اس خلیج کی بڑی وجہ کلاسیکی موسیقی کے صحیح رنگ کو دنیا تک نہ پہنچنا ہے۔

ایک عظیم فنکار کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ فن کی عظمت بر قرار رکھتے ہوئے سامعین کے ذوق کی تسکین کا سامان پیدا کرے تاکہ فنِ سے لگاؤ رکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو سکے۔

کلاسیکی موسیقی کو پروان چڑھانے کے لیے جہاں فاتحین نے خدمات پیش کیں وہیں فنکاروں نے بھی اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا۔ تاریخی لحاظ سے موسیقی میں با قاعدہ گھرانوں کی بنیاد اٹھارویں صدی میں جنگِ آزادی کے بعد مسلمان فنکاروں نے رکھی۔ جن کی مالی معاونت ریاستوں کے راجے اور نواب کیا کرتے تھے۔ ہر فنکار اپنی شخصی سوجھ بوجھ اور سوچ و فکر کے مطابق سُر کو ایک خاص انداز میں پیش کرتا ہے۔ ایک بڑے اور منفرد فنکار کو اس کے منفرد انداز اور اسلوب کی وجہ سے مکتبِ خیال یا گائیکی گھرانہ کہا جاتا ہے۔ انعام ندیم مضمون "کلاسیکی موسیقی میں گھرانوں کا نظام" میں موسیقی کے علمی پہلو کے متعلق رقم طراز ہیں:

> "بر صغیر کی موسیقانہ تہذیب پُر خیال گائیکی کی ترویج اور ترقی نے نہایت خوشگوار اثرات مرتب کیے۔ بعد ازاں جب کلاسیکی موسیقی نے مختلف رنگ اختیار کیے تو موسیقاروں نے فخریہ اپنا تعلق خیالِ گائیکی کے کسی ایک مخصوص گھرانے کے ساتھ جوڑا۔ اور اس گھرانے کی روایات کو مذہبی عقیدت کے ساتھ اختیار کیا۔"[۱۷]

آج کل کلاسیکی موسیقی کے چند مشہور گھرانے کرانہ، گوالیار، تلونڈی، آگرہ، بھنڈی بازار، جے پور اور پٹیالہ گائیکی ہے۔ موسیقی جب کلیساؤں اور مندروں کی مقدس فضا سے نکل کر مغل بادشاہوں کے دربار کی زینت بنی تو فن کاروں اور گلوکاروں کو دربار شاہی تک رسائی حاصل ہو گئی جو کہ ان کے فن میں نکھار کا سبب بنی۔ کلاسیکی موسیقی میں ان گھرانوں نے بڑے بڑے فنکاروں کو جنم دیا۔

بر صغیر پاک و ہند میں کسی گھرانے کی کم از کم چار یا اس سے زائد نسلوں کو اس فن سے منسلک رہنے کے بعد اسے موسیقار گھرانے کا درجہ عطا کیا گیا۔ پاکستان میں اس وقت چار ایسے گھرانے ہیں جن میں نسل در نسل فنِ

موسیقی کو اختیار کیا گیا اور ان کی موجودہ نسلیں بھی نہایت محنت اور لگن کے ساتھ اس فن کو آگے بڑھانے کے لیے کوشاں ہیں۔ ان گھرانوں میں گوالیار، شام چوراسی، قصور اور پٹیالہ گھرانے شامل ہیں۔ ان تمام گھرانوں میں بھی موسیقی کی دنیا میں جس گھرانے کو سب سے زیادہ عزت و مقام حاصل ہوا وہ ہے پٹیالہ گھرانہ۔ اس گھرانے سے تعلق رکھنے والے حسین بخش گلو، حامد علی خان، استاد امانت علی خان اور اسد امانت علی کو پاکستان ٹیلی ویژن کی وجہ سے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس نسل کے بزرگ تو کلاسیکی موسیقی تک محدود رہے مگر نئی نسل جس میں امانت علی خان اور ولی حامد علی خان شامل ہیں مل کر کلاسیکی موسیقی کے ساتھ ساتھ جدید موسیقی میں بھی اپنا نام بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں انعام ندیم مضمون "کلاسیکی موسیقی میں گھرانوں کا نظام" میں رقم طراز ہیں:

> "موسیقی کی ترویج و ترقی میں پنجاب کی مختلف ریاستوں اور گھرانوں نے بے حد اہم کردار ادا کیا۔ یہاں موسیقی کے جن گھرانوں نے عروج پایا اس میں تلونڈی، شام چوراسی، میربانہ، پٹیالہ اور گوالیار گھرانے شامل ہیں۔۔۔۔ پٹیالہ گھرانے کا بانی استاد علی بخش خان اور استاد علی فتح خان کو سمجھا جاتا ہے۔ وہ مہاراجہ، پٹیالہ بھوپندر سنگھ کی وجہ سے پٹیالی گھرانہ کے نام سے معروف ہوئے۔ ان کے دربار سے جو موسیقار وابستہ تھے ان میں برکت اللہ خان، ممن خان، عبدالعزیز خان، کالے خان اور علی بخش کے بیٹے اختر حسین خان شامل تھے۔ اختر حسین خان کے ہونہار بیٹے امانت علی خان سے استاد فتح علی خان اور استاد حامد علی خان میں منتقل ہوا۔"[18]

کلاسیکی موسیقی کے حوالے سے اس گھرانے کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہوا وہ کسی اور گھرانے کو نصیب نہ ہو سکا۔ امانت خان نے کلاسیکی کے ساتھ جدید موسیقی کے امتزاج سے نئی دھنیں ترتیب دینے کی کوشش کی۔ کلاسیکی گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود یہ گلوکار جدید دھنیں اور محسور کن تال تخلیق کرنے میں ماہر ہیں۔ ان کا اندازِ گائیکی اس بات کا غماز ہے کہ وہ کسی عظیم استاد سے سُر تال کی تربیت لے کر آئے ہیں۔ پٹیالہ گھرانے کی چھٹی نسل کے سعادت شفقت پٹیالی گھرانے کا نام بھارتی ریاست پٹیالہ میں رہنے کی وجہ سے پڑا۔ اس گھرانے کے بانی و بزرگ جرنیل علی بخش خان اور کرنیل فتح علی خان تھے۔ ان کی شاندار موسیقی کی وجہ سے ریاست پٹیالہ کے مہاراجہ نے انہیں کرنیل اور جرنیل کے خطابات دیئے۔ برصغیر میں پٹیالہ گھرانے کو جو مقبولیت اور دوام حاصل ہوا وہ اور کسی

گھرانے کے حصے میں نہ آیا۔ اس گھرانے نے ایسے ایسے نام فنِ موسیقی کو دیئے کہ رہتی دنیا تک اس کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

پٹیالہ گھرانے کے بعد دوسرا بڑا گھرانہ گوالیار گھرانے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کا نام بھارتی صوبے مدھیہ پردیش کے ایک شہر کی نسبت سے رکھا گیا ہے۔ اس گھرانے میں غلام رسول خان، امید علی خان، منظور علی خان اور فتح علی خان شامل ہیں۔ گوالیار گھرانے کی امتیازی اور منفرد علامت ان کی سادگی تھی۔ ان میں سُروں میں لگانے کے مشکل اور پیچیدہ انداز نہ تھے۔

۲۔ شخصیتِ موسیقار پر مضامین:

جہاں ایک طرف موسیقی کے بڑے بڑے گھرانوں نے نامور فنکاروں کو جنم دیا۔ تو وہیں دوسری طرف ان گھرانوں کے علاوہ بھی نامور فنکار سامنے آئے اور موسیقی کی دنیا میں ایک نام اور مقام پیدا کیا۔ ان میں ایک نام ریشماں کا ہے۔ انتہائی دلکش آواز کی مالک ریشماں کے گیت آج تک لوگوں کے کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ ریشماں کی آواز راجستان کے ٹھیلوں سے ابھری اور پورے برصغیر میں اس کی گونج سنائی دی۔ انعام ندیم مضمون "ریشماں" میں لکھتے ہیں:

> "ریشماں کا جنم ہیکا شہر میں ہوا جو کہ راجھستان کا شہر ہے۔ ان کا بچپن اور لڑکپن سندھ کے مزارات پر گاتے بجاتے گزرا۔ مزارات کے ساتھ ریشماں کی محبت ہمیشہ قائم رہی۔ اسی طرح خانہ بدوشی کی خوبو بھی ہمیشہ ان کی شخصیت کا حصہ رہی۔ ریشماں نے متعدد زبانوں میں گیت گائے جن میں ان کی مادری زبان راجھستانی کے علاوہ اردو، پنجابی، سندھی اور سرائیکی بھی شامل ہیں۔"[۱۹]

ریشماں نے جتنی بھی زبانوں میں گیت گائے ان سب کو یکساں مقبولیت حاصل ہوئی۔ کلاسیکی موسیقی میں ریشماں کی آواز ہمیشہ قائم و دائم رہے گی۔ اس ضمن میں "انعام ندیم "مضمون "ریشماں" میں لکھتے ہیں:

> "ریشماں کی آواز دھرتی کی آواز تھی۔ ریشماں کو سنتے ہوئے یہ احساس ہو تا کہ کائنات کی لامحدود وسعتوں میں صدیوں سے قائم یہ دھرتی اگر ہم سے ہم کلام کرنا چاہے تو اس کی آواز ریشماں کی آواز کے مشابہ ہو گی۔ ریشماں کا ایک راجھستانی لوگ گیت " پھول بنڑو" سنتے

ہوئے یہ احساس دوچند ہو جاتا ہے اور یوں محسوس ہو تا ہے جیسے دھرتی ماں اپنے بچوں پر اپنے گیت کے ذریعے سے اپنی لافانی محبت نچھاور کر رہی ہے۔"[۲۰]

ریشماں کی آواز اتنی سحر انگیز تھی کہ یوں معلوم ہو تا تھا کہ پنجاب کی مٹی کی سوندھی مہک کو اپنے اندر سمور کھا ہے۔ان کی آواز امن، محبت، اخوت اور بھائی چارے کی آواز تھی۔ان کی آواز میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کے رنگ نمایاں نظر آتے ہیں۔ریشماں کی آواز شاید کسی قدیم زمانے کے رہبر کی آواز تھی۔جو ہم تک پہنچی اور ہمیں بہت کچھ سکھا کر پھر وہ کہیں اپنے زمانے میں لوٹ گئی۔

کسی بھی آواز میں اگر آہنگ اور ترنم ہو تو سُروں پر سوار ہو کر کانوں میں رس گھول دیتی ہے۔اچھی موسیقی اور آواز لفظوں میں جان ڈال دیتی ہے۔مگر اچھی اور معیاری شاعری کے بغیر دلفریب موسیقی کا وجود ناممکن تھا۔ظفر تاج صاحب ایک ایسے ہی باکمال شاعر ہیں جنہوں نے اتنے اچھے اور جاندار انداز میں گا کر ساز اور آواز کی دنیا میں ہلچل مچادی۔انہوں نے موسیقی کی دنیا میں ایک نیا آہنگ عطا کیا۔ایسا ریشمی احساس دیا کہ یہ زندگی کے قریب تر معلوم ہونے لگی۔انہوں نے موسیقی کا ذوق رکھنے والوں کو ایک منفرد مگر اپنائیت سے بھرپور ذائقہ دیا۔احمد سلیم سلیمی اپنے مضمون "جدید شنا شاعری، گائیکی شنا کی مفلسی" میں لکھتے ہیں:

"ایک شاعر جس نے شنا (شاعری) کو ایک فطری آہنگ دیا۔ایک ریشمی احساس دیا۔لفظ ویسے تو ایک مجرد شے ہے اس میں جب زندگی کے رنگ شامل ہو جائیں تو احساس بن کر دھڑکنے لگتے ہیں کانوں میں نرم نرم سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں۔اس شاعر نے لفظوں کو بولنا سکھایا ہے۔سادگی، بے ساختگی اور فطری اظہار ان کے تن میں بھی ہے ان کے فن میں بھی۔"[۲۱]

کلاسیکی کا بڑا نام زاہدہ پروین پاکستان کی موسیقی کا جانامانا ہوا بڑا نام ہے۔انہوں نے کلاسیکی، نیم کلاسیکی اور لوک موسیقی میں اپنا نام منوایا۔فن موسیقی کی بنیادی تعلیم تاج واں سارنگ سے حاصل کی۔ان کی موسیقی میں نکھار کا بڑا ذریعہ پٹیالہ گھرانہ بنا۔پٹیالہ گھرانے کے نامور موسیقار کی شاگردی میں خوب محنت سے کام کر کے اپنا نام بنایا۔بدر الزماں اپنے مضمون "ملکہ کافی ذاہدہ پروین" میں تحریر کرتے ہیں۔

"زاہدہ پروین کی گائیکی، پھنڈ، کنگری اور چوڑی آواز والی تانیں یہ سبھی خواص موجود تھے۔ ---آواز کے لگاؤ بڑے خوبصورت اور نفیس تھے۔ان کے گانے میں اپج اور آمد سب

ملتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ لے سے کھلے اور بند دونوں انداز سے کھیلنا انہی کا حصہ تھا۔
مطلب یہ کہ ان کا گانا پابندی اور آزادی دونوں کا ہر گز محتاج نہ تھا۔ گاتے وقت ان کے
مزاج کی لہر جس طرح نکل جاتی ویسا ہی ان کا گانا بن جاتا۔"[۲۲]

زاہدہ پروین فنِ موسیقی کا ایک درخشاں ستارہ تھیں۔ ان کے گائے ہوئے لوک گیت آج بھی سنٹرل پروڈکشن لائبریری میں موجود ہے۔پاکستان کے قومی ادارے لوک ورثہ نے ان کے گانوں کی آڈیو کیسٹ بھی ریلز کیے تھے۔جو کہ آج تک وہاں کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔موسیقی کا یہ ستارہ ۷ مئی ۱۹۷۵ بروزِ بدھ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ مگر ان کا فن رہتی دنیا تک ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

نثار بزمی دنیائے موسیقی کا معتبر نام ہیں۔دسمبر ۱۹۲۴ کو صوبہ مہاراشٹر میں پیدا ہوئے۔دنیائے موسیقی کا ایک چمکتا ستارہ جس کی روشنی سے ہمیشہ لوگ محظوظ ہوتے رہیں گے۔انہوں نے اپنی فنی زندگی کا آغاز ریڈیو پاکستان سے کیا۔ڈاکٹر نثار ترابی اپنے مضمون "نثار بزمی" میں نثار بزمی کی لازوال موسیقی سے متعلق تحریر کرتے ہیں:

"نثار بزمی دنیائے موسیقی کا ایک ایسا معتبر نام ہے۔جو اپنی فنی زندگی کے آغاز میں ریڈیو
گنگناتے اُفق سے طلوع ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں شائقین کے دلوں کی دھڑکن بن
گیا۔ تال تال جھوم اٹھا، سُر سنورنے لگے، فضائیں مترنم ہونے لگیں اور عقیدت میں آکر ہر
ساز پکار اٹھا۔۔۔ ریاضت فن میں گہرے خلوص، سچے جذبے اور ان تھک لگن نے انہیں
زندگی کی بے انتہا تلخ اور تھکا دینے والی طویل آزمائشوں سے گزار کر سر تا پا کندن بنا دیا۔"[۲۳]

نثار بزمی نے آل انڈیا ریڈیو میں چند سال بطورِ موسیقار کام کیا۔ ۱۹۴۶ میں باقاعدہ طور پر فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ان کی پہلی فلم "جمنا پار" تھی۔ہندوستان میں پندرہ برس کام کرنے کے بعد آپ پاکستان تشریف لائے ۔یہاں آپ کی پہلی فلم "ایسا بھی ہوتا ہے" تھی پاکستان کی فلم انڈسٹری میں قدم رکھنا ان کے لیے مبارک ثابت ہوا۔پاکستان کی فلم انڈسٹری میں بے شمار دھنیں ترتیب دیں۔ جنہوں نے انہیں شہرت کی بلندی پر پہنچا دیا۔ نثار بزمی نے پاکستان کی موسیقی کے نمایاں فن کار جن میں حمیرا چنا، نیرہ نور اور عالمگیر شامل ہیں آپ کی وجہ سے شہرت کی بلندیوں پر پہنچے۔ آپ نے نہ صرف دوسرے شعراء کے کلام پے دھنیں ترتیب دیں بلکہ آپ خود بھی با

کمال شاعر تھے۔ ان کا شعری مجموعہ " پھر ساز سدا خاموش ہو" کے نام سے منظر عام پر آیا۔ ڈاکٹر نثار ترابی اپنے مضمون " نثار بزمی" میں لکھتے ہیں۔

" آپ کا شمار ان گنی چنی شخصیات میں ہو تا ہے جنہوں نے موسیقی کے شعبے میں جو اچھوتے اور انوکھے تجربے کیے۔ وہ بہت موئثر، کشش انگیز اور کامیاب ثابت ہوئے۔ جو رنگا رنگ دھنیں عطا کیں سبھی کو سراہا گیا۔ عوامی مزاج اور ثقافتوں کے پیشِ نظر بزمی صاحب نے جہاں ہلکے پھلکے گیتوں کو اپنے کومل سُروں سے مشکبار کیا۔ وہاں خالصتا کلاسیکی اسلوب و انداز کے حامل گیت اور غزلیں بھی شائقین موسیقی کی نذر کر کے واہ واہ سمیٹی۔ کمپوزیشن میں نئی نئی راہیں اور روشیں نکال کر ندرتِ فن کا لوہا منوایا۔"[۲۴]

نثار بزمی کو ان کی خدمات کے عوض حکومتِ پاکستان نے تمغہ برائے حسنِ کارکردگی سے نوازا۔ آپ جہاں دھنوں اور سُروں کے معاملے میں بہت سخت تھے وہیں دل کے انتہائی نرم تھے۔ انہوں نے اپنی عمر کا آخری حصہ تنہائی میں گزارا۔ اور یہی گوشہ نشینی ان کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچا گئی۔ آپ ۲۲ مارچ ۲۰۰۷ کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ آپ بظاہر دنیا سے چلے گئے مگر آپ کے حسنِ آواز کو کبھی بھلایا نہ جا سکے گا۔

برصغیر پاک وہند کی فلمی موسیقی پر نگاہ دوڑائی جائے تو اس میں بڑا حصہ پنجاب کا نظر آتا ہے۔ موسیقی کا جو دلکش اور عام و فہم انداز پنجاب نے دیا وہ کسی اور صوبے کے حصے میں نہ آیا۔ پنجاب میں موسیقی کو پروان چڑھانے والوں میں پہلا نام ماسٹر غلام حیدر کا لیا جاتا ہے۔ ان کے بعد دوسرا اہم نام خواجہ خورشید انور رہے۔ خواجہ خورشید انور ۲۱ مارچ ۱۹۱۲ کو میانوالی میں پیدا ہوئے۔ موسیقی کی دنیا میں ایسا قدم جمایا کہ آنے والی دنیا ان کے فن سے ہمیشہ محظوظ ہوتی رہے گی۔ آپ نے فلسفہ میں ایم۔اے کیا اور ICS سول سروس انڈیا کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ خورشید انور ایک ایسا درخشاں ستارہ ہیں جس کے سامنے پورے برصغیر کی فلم انڈسٹری ہاتھ باندھ کر خاموش کھڑی رہتی ہے۔ " عقیل عباس جعفری" اپنے مضمون "خواجہ خورشید انور "میں تحریر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”اس دور میں موسیقی پیشہ وروں تک محدود تھی اور کسی بلند پایہ علمی ڈگری کے حامل شخص کے لیے اپنی زندگی موسیقی کے لیے وقف کر دینا ایک انہونی بات تھی۔ مگر خورشید انور کے

لیے کوئی بات انہونی نہیں تھی۔ ان کی زندگی تو پیتھوں کے اس مقولے کی زندہ مثال بنتی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ موسیقی دنیا بھر کے فلسفے اور منطق سے بڑی بخشش ہے۔"[۲۵]

خواجہ صاحب کا موسیقی ترتیب دینے کا انداز بھی باقی موسیقاروں سے جدا، انوکھا اور منفرد تھا۔ "عقیل عباس جعفری" اپنے مضمون "خواجہ خورشید انور" میں لکھتے ہیں:

"دنیا کا ہر فنکار ایک ایسی تخلیق کی تمنا کرتا ہے جو رہتی دنیا تک لوگوں کو اسکا نام یاد دلاتی رہے۔ 'کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی' کی تشریح موسیقی کی جہت میں خواجہ خورشید انور کی تخلیق کردہ موسیقی سے بہتر شاید ہی کوئی اور موسیقار کر سکے۔"[۲۶]

آپ ۱۹۴۰ میں "کڑمائی" نامی فلم سے فنی زندگی کی ابتداء کی اور اس وقت میں ہندوستانی فلم پر ماسٹر غلام حیدر، شیام سندر اور نوشاد جیسے موسیقار چھائے ہوئے تھے۔ مگر خواجہ صاحب کو اپنے فن پر عبور حاصل تھا اور ان کی انفرادیت نے انہیں جلد ہی بلند مقام تک پہنچا دیا۔ وہ نہ صرف موسیقار تھے بلکہ پروڈیوسر اور شاعر بھی تھے۔ انہوں نے ہدایت کار مسعود پرویز کے اشتراک سے اپنی مایہ ناز فلم "انتظار" بنائی جس کے نغمات قتیل شفائی نے گائے۔ اس فلم نے کامیابیوں کے نئے ریکارڈ بنائے۔ اور اس برس بہترین موسیقی، بہترین فلم اور بہترین کہانی کے صدارتی ایوارڈ بھی اس فلم کے حصے میں آئے۔ اس فلم کو نہ صرف پاکستان میں پذیرائی ملی بلکہ پورے ہندوستان میں بھی اس نے مقبولیت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ آپ کی موسیقی سے سجے ہوئے ان نغمات کو نور جہاں کی دلکش اور دلفریب آواز نے لازوال بنا دیا۔ اس فلم کی موسیقی دل سوز اور ترنم سے بھرپور تھی کہ اس کی بدولت نور جہاں کو "ملکہ ترنم" کا اعزاز حاصل ہوا۔ "عقیل عباس جعفری" اپنے مضمون "خواجہ خورشید انور" میں لکھتے ہیں:

"عام طور پر وہ ماچس کی ڈبیا پر اپنی انگلیوں سے درھم دے کر موسیقی تخلیق کرتے تھے۔ وہ اپنی ساری دھنیں خود ترتیب دیتے اور ان میں کئی کئی دن گزار دیتے۔"[۲۷]

ان کا پسندیدہ ساز بانسری تھا۔ اور ان کی موسیقی میں اس کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ "عقیل عباس جعفری" اپنے مضمون "خواجہ خورشید انور" میں لکھتے ہیں:

"خواجہ خورشید انور ایک ورسٹائل فنکار تھے وہ فلسفے کے طالب علم بھی تھے۔ شاعر بھی تھے، موسیقار بھی تھے۔ کہانی کار بھی، ہدایت کار بھی اور فلم ساز بھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ

انہیں اتنی مختلف حیثیتوں میں فلم ساز بننا زیادہ پسند تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ موسیقار کی حیثیت سے ان کا مقام مسلمہ تھا۔"[۲۸]

انہوں نے کلاسیکی موسیقی میں جو کام کیا وہ قابلِ تحسین ہے۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۴ کو یہ تابندہ دیا بجھ گیا۔ آپ لاہور میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ نے لازوال دھنیں تخلیق کیں اور جو دلکش موسیقی سُر بنائی وہ آپ کو ہمیشہ کے لیے زندہ وجاوید کر گئی۔ وہ خود تو فانی تھے مگر ان کی موسیقی اور ہدایتکاری انہیں لافانی کر گئی۔

گزشتہ چند دہائیوں کے دوران جن خاتون گلوکاروں نے ہندوبیرون ہند اپنی آواز کا جادو جگایا، اور جنھیں عوام وخواص میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ان میں لتا منگیشکر کا نام سرفہرست ہے۔ لتا منگیشکر نے تقریباً سات دہائیوں تک ہندی سنیما کو اپنی آواز دی اور چار نسلوں کو اپنے گائے ہوئے نغموں سے مسحور کیا۔ نہایت کم عمری ہی میں وہ مقبولیت کے زینے چڑھنے لگی تھیں۔ تقریباً بیس سال کی عمر میں ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کلاسیکی نغموں کی گونج ہر طرف سنائی دیتی تھی، لتا جی نے ان نغموں کو بہترین انداز میں گایا اور لوگوں کا دل جیت لیا۔ اس کے بعد بدلتے وقت اور ماحول میں وہ اپنی گائیکی کو ڈھالتی رہیں اور ایک کے بعد ایک کامیاب نغمے ہندی سنیما کو دیتی رہیں۔ یہاں تک کہ جب بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں نئے انداز کے نغموں کا رواج بڑھا تب بھی لتا جی کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی اور ان کے اس دور کے گائے ہوئے گانوں کو بھی پسند کیا گیا۔ دراصل لتا جی حقیقی معنوں میں فنکار تھیں، ان کی آواز میں جادو جیسی تاثیر تھی اور ان کا ترنم دل وروح میں اترنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس لیے وقت کا اتار چڑھائو ان کے فن کو متاثر نہ کر سکا بلکہ جیسے جیسے وقت بڑھتا گیا، اس میں اور زیادہ نکھار پیدا ہوتا گیا۔

لتا منگیشکر کی گائیکی کو جن اسباب کی بنیاد پر مقبولیت حاصل ہوئی ان میں ایک سبب ان کا اردو تلفظ تھا۔ اسی لیے انھوں نے گیتوں میں مستعمل اردو حروف والفاظ کی بہترین ادائیگی کی۔ اردو زبان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خوبصورت الفاظ کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اگر اردو الفاظ کو سلیقے سے گفتگو میں برتا جائے، تو اس میں لطف پیدا ہو جاتا ہے، تحریر کی لڑی میں پرو دیا جائے تو تحریر کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے اور جب ان لفظوں کو شاعری کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے تو شاعری کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہندی تحریروں، تقریروں، نظموں اور گیتوں میں بھی اردو الفاظ کا خوب استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو کی اسی شیرینی کو محسوس کرتے

ہوئے ہندی سنیما بھی ہندی فلموں کے مکالموں اور گیتوں میں اردو الفاظ کے استعمال میں کسی سے پیچھے نہیں رہا، خاص طور سے ہندی سنیما میں ابتدائی کئی دہائیوں تک تو اردو کا ہی دبدبہ قائم تھا۔ اس وقت کے نغمے لکھنے والے شعرا ساحر لدھانوی، شکیل بدایونی، مجروح سلطانپوری اردو کے عظیم شاعر تھے۔ یہ تمام حضرات غزل گوئی میں بھی اپنا مقام رکھتے ہیں۔ ان کے لکھے گئے نغموں کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے نغموں میں بھی شاعری کے معیار سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ اس وقت کے مقبول نغمے سنیے، آپ کو ان میں بہترین شاعری نظر آئے گی اور یہ بھی دکھائی دے گا کہ شعرا نے نغموں کی لڑی میں اردو کے خالص اور خوبصورت لفظوں کو کس حسن وخوبی کے ساتھ پرویا ہے۔ لتا منگیشکر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان لفظوں کا تلفظ بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے، جس کی وجہ سے ان نغموں میں جان پڑ گئی۔

اگرچہ دوسری اور بھی بہت سی گلوکارہ ایسی ہیں جو اردو الفاظ کا صحیح تلفظ کرنے کی کوشش کرتی ہیں، لیکن جس خوبصورتی کے ساتھ لتا جی ان کی ادائیگی کرتی ہیں، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان کا گایا ہوا گانا ''ترے بنا زندگی سے کوئی شکوہ تو نہیں'' میں 'ز' کی ادائیگی انھوں نے بہت خوبصورتی کے ساتھ کی ہے۔ تلفظ کی جو نزاکت اردو میں ہوتی ہے، اس کا پورا خیال انھوں نے رکھا ہے۔ 'ز' کو انھوں نے نہ تو 'ذال' کی طرح ادا کیا ہے اور نہ ہی اس کو رگڑ کر ادا کیا ہے اور یہی اردو کے حروف کی ادائیگی کا مزاج بھی ہے۔ اسی گانے میں لفظ 'شکوہ' کی ادائیگی بھی بہت خوبصورت ہے۔ ان کا گایا ہوا گانا 'لگ جا گلے' بہت مشہور ہوا۔ اس گانے کی کئی ایک خصوصیات ہیں۔ یہ گانا لفظ کے اعتبار سے بھی بہت عمدہ ہے اور معنی کے اعتبار سے بھی۔ اس کے علاوہ اسے مزید پر کشش اور موثر لتا جی کی آواز نے بنا دیا ہے کہ سننے والا کھو سا جاتا ہے۔

موسیقی میں آواز کے زیر و بم کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی بھی سطح پر ذرا سی چوک نہ صرف ترنم کو متاثر کر سکتی ہے بلکہ اس کی خوبصورتی پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ گائیکی میں ایک اور دقت یہ ہوتی ہے کہ کئی مرتبہ لفظ کی صحیح طور پر ادائیگی کی صورت میں ترنم یا سر کے متاثر ہونے کا خوف دامن گیر رہتا ہے اور اگر سر چلا جاتا ہے تو پھر بات ہی خراب ہو جاتی ہے، اس لیے حرف کی ادائیگی کے وقت اس بات پر بھی دھیان دینا پڑتا ہے کہ کہیں ادائیگی کے سبب سر ہی غائب نہ ہو جائے۔ اب یہاں اگر 'ملاقات' کے حرف 'ق' کو زیادہ حلق سے رگڑ کر نکالا جائے گا تو سر یا ترنم کے متاثر ہونے کا خدشہ ہے اور اگر 'قاف' کی آواز کو 'کاف' کی آواز میں ادا کیا جائے گا تو لفظ کی خوبصورتی کا

ختم ہونا یقینی ہے۔ ایسے میں کمال یہ ہے کہ حرف 'قاف' بھی ادا ہو جائے، سر بھی غائب نہ ہو یعنی ترنم کی کشش بھی باقی رہے اور لفظ کا حسن بھی ختم نہ ہو۔

ایسے مواقع پر لتا منگیشکر بہت خوبصورتی کے ساتھ اپنا رول نبھاتی ہیں۔ لفظوں کی صحیح ادائیگی کرتی ہیں، اور ترنم یا سر کو بھی متاثر نہیں ہونے دیتیں۔ جبکہ کتنے گلوکار ایسے مواقع پر پوری طرح کامیاب نہیں ہو پاتے۔

لتا جی کا گایا ہوا ایک اور گانا 'اک پیار کا نغمہ ہے' بھی بہت مشہور ہے۔ اس گانے میں مستعمل لفظ 'نغمہ' کا حرف 'غ' ادائیگی کے اعتبار سے توجہ طلب ہے۔ لتا جی نے 'غین' کو اس کے صحیح مخرج کے ساتھ ادا کیا ہے۔ اس گانے کو نیتی موہن نامی ایک گلوکارہ نے بھی نقل کرتے ہوئے گایا ہے مگر وہ حرف 'غین' کو ٹھیک سے ادا نہ کر پائیں اور لفظ 'نغمہ' کا 'غین' حرف 'گاف' میں بدل گیا، اس طرح ان کی زبان سے یہ لفظ 'نگمہ' بن کر نکلا۔ ظاہر ہے کہ جب لفظ کا تلفظ ہی ٹھیک سے نہ کیا جائے تو اس میں کشش کہاں باقی رہے گی۔

فلم 'سوتن' کا گیت 'شاید میری شادی کا خیال۔ دل میں آیا ہے'' لتا منگیشکر نے گایا ہے۔ یہ گانا شوخی بھرے انداز میں گایا گیا ہے۔ اس گانے کی خوبی یہ ہے کہ اسے سننے والا سنتے سنتے خود بھی گانے لگتا ہے۔ اس نغمے کا گنگنانا 'شاید میری شادی کا خیال' تلفظ کے اعتبار سے ہر ایک کے لیے آسان نہیں ہے۔

لتا منگیشکر کا گایا ہوا گیت 'اے میرے وطن کے لوگو!' عام طور پر ان محفلوں میں خوب سننے کو ملتا ہے جہاں وطن سے محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ لتا نے اس گانے کو جس دل سے گایا ہے، اس کا اندازہ تو اسی وقت ہو جاتا ہے جب اس کی چند لائنیں کانوں میں پڑتی ہیں۔ اس گیت کے الفاظ، تفہیم، ترنم، آواز، موسیقی سب کچھ بہت عمدہ ہے۔ اسی لیے یہ گیت سامعین کی سماعتوں کی حدود سے ٹکرا کر واپس نہیں آتا بلکہ دل کی گہرائیوں میں اترتا جاتا ہے اور سننے والے کو ایسے ماحول میں لے جاتا ہے، جس میں ہر طرح کی قربانی کے جذبات موجزن ہونے لگتے ہیں۔ اس گیت کو گاتے وقت لتا جی نے اپنے فن کا ہر اعتبار سے شاندار مظاہرہ کیا ہے اور اس گیت کی روح میں اپنی روح ملا دی ہے، لیکن ایک اور چیز یہاں قابل توجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس گیت میں استعمال ہونے والے تمام الفاظ کا تلفظ نہایت خوبی کے ساتھ کیا ہے کہ اگر اس پہلو سے اس گیت پر غور کیا جائے تو اس کا مزہ دوچند ہو جاتا ہے۔ اس گیت میں اردو کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ اس طرح ہیں ذرا، قربانی، شہید، خطرہ، آزادی، سرحد، خون، ہندوستانی، بندوق، ہوش، خوش، سفر، دیوانے وغیرہ۔ ان تمام ہی الفاظ کا تلفظ لتا جی کے ذریعے بہترین انداز میں

کیا گیا ہے۔ خاص طور پر یہ تین الفاظ ذرا، قربانی اور شہید کا تکرار اس گیت میں بار بار ہوتا ہے اور تینوں لفظوں کی ادائیگی نہایت خوبصورت ہے۔ اگر ان کے تلفظ میں ذرا بھی کمی رہ جاتی تو شاید اس گیت کی کشش پر بھی فرق پڑتا اور جوش و تاثیر میں بھی کمی واقع ہو جاتی۔ لیکن لتا منگیشکر نے لفظوں کے تلفظ کی نزاکت کو ہر جگہ ملحوظ رکھا۔

فلمی میوزک کی وسیع دنیا میں شاید ہی کوئی کوچہ اے آر رحمان کی خواب ناک دھنوں سے محروم رہا ہو۔ وہ جہاں سے گزرے ایسا اجلا نقش چھوڑا کہ آئندہ کئی عشروں کا گرد و غبار بھی اسے دھندلا نہ سکے گا۔ رحمان نے قوالی کو تکنیکی اور موضوعاتی ہر دو اعتبار سے تبدیل کیا۔

ہمیں تو لوٹ لیا مل کے حسن والوں نے' سے لے کر 'نہ تو کارواں کی تلاش ہے' اور 'تیری محفل میں قسمت آزما کر ہم بھی دیکھیں گے'، سمیت بیشتر فلمی قوالیاں تصوفانہ کے بجائے عاشقانہ رنگ میں رنگی ہوتی تھیں۔ جس طرح بھجن فلم میوزک کا حصہ چلا آ رہا تھا، ویسے ہی مسلم سماجی پس منظر کے ساتھ دربار اور قوالی کو باقاعدہ منسوب کر کے دیکھنا اے آر رحمان سے پہلے بالی وڈ میں باقاعدہ رجحان کی صورت کبھی نہ تھا۔

اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ رحمان نے قوالی کا دائرہ محدود کر دیا۔ بمبئے ڈریمز میں شامل ویڈنگ قوالی اور کہنا ہی کیا (بمبئی ۱۹۹۵) سمیت کئی مثالیں موجود ہیں جہاں خالص رومانوی گیت میں رحمان نے قوالی کا آہنگ استعمال کیا ہو۔

شنکر احسان لوئے کا 'کجرا رے'، ہو، متھون کا 'آنکھیں تیری کتنی حسین'، ہو یا جوبن نوٹیال کا 'دل غلطی کر بیٹھا'، ہو، ہر جگہ اے آر رحمان کے اثرات واضح محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

یہ بالی وڈ میں قوالی کے نئے کلچر کا فروغ ہے جسے ٹیکنو قوالی یا کلب قوالی سے ملا کر دیکھیں تو اچھا خاصا وسیع سلسلہ بنتا ہے۔ اگر اس کی پشت پر رحمان کا کی بورڈ نہ ہوتا تو شاید ہم اتنی خوبصورت دنیا سے محروم رہتے۔

فلمی میوزک میں انقلاب برپا کرنے والے اے آر رحمان قولی کی نئی جمالیاتی تشکیل میں بھی اس مقام پر ہیں جہاں دیگر معاصر موسیقار ان کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ رحمان نے قوالی جیسی مقامی صنف میں جدید مغربی آلات موسیقی کا استعمال اس نزاکت سے کیا کہ جمالیاتی احساس ذرا بھی مجروح نہیں ہوتا۔ کلام عارفانہ ہو، عاشقانہ ہو یا دونوں کی آمیزش بہر حال ایسے گیتوں کی خاص بات رحمان کا میوزک ہوتا ہے۔ ان

کی دھنوں کی ترتیب میں سوز بھی ہے اور درد بھی۔ کبھی غم کی کیفیت کو اتنے دلکش انداز میں ترتیب دیتے ہیں کہ سننے والا اس کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ تو کبھی ایسی خوشی اور سرور کی گیت بناتے ہیں جو ہر انسان کے لیے باعث راحت ہوتے ہیں۔

ج۔ فنِ خطاطی:

نفیس قلم، دلکش اور اعلیٰ خوش خطی کو خطاطی کہا جاتا ہے۔ اپنی فکر و سوچ کو دوسرے تک پہنچانے کا بہترین ذریعہ تحریر ہے۔ جس میں سیاہی، قلم، برش جیسے آلات کو استعمال میں لاتے ہوئے مختلف اشکال یا علامتوں کے ذریعے اپنی سوچ کو دوسروں تک منتقل کیا جاتا ہے۔ تحریر مصوری یا خاکہ سازی کی طرح قاعدوں اور قوانین کی پابند نہیں ہوتی بلکہ اس میں کافی حد تک آزادی ہوتی ہے۔ تحریر میں حروف کو مختلف انداز میں لکھا جاسکتا ہے۔ اور انہی الفاظ کو ایک خطاط کا قلم جب تحریر کرتا ہے تو ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ ان کی ترتیب و تناسب ان کو انتہائی دلکش اور پر اثر بنادیتا ہے۔ انسان میں جمالیاتی احساس قدرتی طور پر موجود ہے۔ اس لیے اس نے فطرتاً ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ ان میں شعوری یا غیر شعوری دونوں طرح سے تحریر کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔

حسِ جمال کا جب ہم کلچر، آرٹ اور فنون لطیفہ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں تو وہ معروضی کے بجائے موضوعی مطالعہ ہوتا ہے جس میں انفرادی احساسات کا اظہار ہوتا ہے۔ کلچر، آرٹ اور فنون لطیفہ کا تعلق کسی فرد یا معاشرے کے کسی خاص وقت کے موضوعی اور اندرونی احساسات سے ہوتا ہے۔ اور فنون کی سطح پر اصل میں شے اور موضوع ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں۔ اس لیے اسلام کے نزدیک آرٹ اور سائنس دو جداگانہ علوم کے شعبہ جات نہیں ہیں بلکہ وہ ایک ہیں اور ان دونوں میں قدر مشترک توحید ہے۔ مغربی تصور علم کی طرح نہیں کہ آرٹ اور فنونِ لطیفہ سائنس کی صف سے الگ کھڑے ہوتے ہوں، بلکہ جمالیاتی حس کے ساتھ جب کائنات کا مطالعہ اور سماج کا مشاہدہ کیا جاتا ہے تو کائنات اور سماج کی حقیقتیں بھی سامنے آتی ہیں اور احساسات و تاثرات بھی ذہن میں ابھرتے ہیں۔ اس حوالے سے "طارق شاہد" اپنے مضمون "خیال کے رنگوں کا شہر" میں لکھتے ہیں:

> "اسلامی تہذیب و تمدن جمال سے مزین ہے۔ یہاں عبادات میں سنجیدگی، کلام میں شائستگی، سلام میں متانت، اکل و شرب میں توازن، مسجد و مینار میں اسلامی فنون کی عکاسی، اسلامی طرز تعمیر کی فن کاری، ادب میں رفعت و پاکیزگی کا نظارے ملتے ہیں۔ اس پر تفصیل

سے آگے کے سلسلے مضامین میں گفتگو ہو گی۔ یہاں صرف اس پر اکتفا کرنا ہے کہ فن
کارانہ جمالیات کے حسین و دل کش رنگوں کی ابتدا بھی قرآن ہی سے ہوتی ہے۔"۲۹

اسلامی تہذیب میں علوم و فنون کا ابجد قرآن کی خطاطی سے شروع ہوا۔ قرآن کے لکھنے میں انسانی ذہن کی اختراع و ایجاد کے اعلی ترین نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ خطاطی نقش و نگاری، جیومیٹری، رنگوں کا حسین امتزاج، پتھر کی سلوں، چمڑے، کاغذ، سونے چاندی کے زیورات تلوار کا دستہ، جنگی لباسوں سے لے کر چاول کے دانوں تک میں قرآنی آیات کندہ ملیں گی۔ مسجد و محراب، گنبد و مینار، مقبروں اور مزاروں کی زینت قرآنی آیات کی خطاطی اور نقش و نگاری سے ہوتی ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں قرآن کی قرأت اور اس کے مقابلے کی محفلیں اسلامی تہذیب کی زندہ اور نمایاں علامات ہیں۔ قرآنی آیات کی خطاطی کے حسین ڈیزائن، خوب صورت طغرے، فنی شہ پارے، مہتمم بالشان یادگار طمغوں کے وساطت سے قرآنی ذوق و شوق نمایاں ہوتا ہے۔ سہ ماہی ادبیات میں خطاطی کے ضمن میں شائع ہونے والے منتخب مضامین یہ ہیں: "خیال کے رنگوں کا شہر" از طارق شاہد (شمارہ ۵۲، ۲۰۰۰ء)، "بن چولہ چوغہ قلندر" از شبہ طراز (شمارہ ۹۶، ۲۰۱۲ء)، "حفظ محمد یوسف سدیدی" از احمد شاہ (شمارہ ۹۷، ۲۰۱۲ء)، "مخدوم صادق حسین ایک تصوراتی وجود" از حمزہ ابنِ وصی (شمارہ ۱۲۶، ۱۲۷، ۲۰۲۰ء)، "آرٹ کیا ہے" از نسیم نیشوز (شمارہ ۹۸، ۲۰۱۳ء)، "مسعود کوہاری کا فن سنگ تراشی" از عباس شاہ (شمارہ ۱۰۲، ۲۰۱۲ء))، "استا اللہ بخش" از شفقت علی جاوید (شمارہ ۲۰۱۳، ۱۰۴ء)،"۔ مذکورہ مضامین کے مطالعے و تجزیے سے یہ بات اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ مضمون نگاروں نے فنِ خطاطی پر مضمون لکھتے ہوئے مذکورہ فن کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں اور ان کے اثرات کی وسعت کو ملحوظ رکھا ہے۔

ا۔ خطاطی کی روایت کے مضامین:

خطاطی ہماری ایک خوبصورت روایت ہے جو کہ کئی سو سال پرانی ہے۔ نسلِ انسانی نے ہمیشہ اس فن کو عزت دی۔ قبلِ مسیح سے لے کر آج تک خوش نویس انسان کو ہمیشہ عزت و وقار کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی اس فن نے گہرے نقوش چھوڑے۔ مغل بادشاہ خاص کر اکبر نے اس فن کو باقاعدہ آرٹ کے طور پر متعارف کروایا۔ اکبر اور دیگر مغل بادشاہوں نے اس فن کو فروغ دینے کے لیے باقاعدہ ہمہ وقتی کاتب مقرر کیے۔ جنہیں سرکاری خزانے سے معاوضہ دیا جاتا تھا۔

اس کی عمدہ مثال "آئینِ اکبری" ہے۔ جس میں اس وقت کے تمام مشہور خطاطوں کے نام درج کیے گئے۔ دنیا خطاطی کے لیے تاج بادشاہ محمد حسین کشمیری بھی اکبر کے دربار سے منسلک تھے۔ جنہیں ان کے عمدہ فن کی وجہ سے "زریں قلم" کے لقب سے نوازا گیا۔ ہمارا ہر خطہ اہلیانِ قلم سے بھرا ہوا ہے۔ ان کے بنائے گئے حسین نقوش سے پوری دنیا محظوظ ہو رہی ہے۔ بر صغیر کے خطاط اپنی خداد صلاحیتوں کی وجہ سے دنیا میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ مغلیہ عہد سے لے کر آج تک ہمارے فنکار پوری دنیا میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتے آئے ہیں۔ اور وہ فن میں کسی بھی طرح دیگر ممالک کے خطاطوں، نقاشوں سے کم نہیں۔ مگر ان کے اعلیٰ فن پاروں کو دنیا کے سامنے اس طرح سے متعارف نہیں کروایا جا سکا جو کہ ان کا حق تھا۔ اگر ہمارے فنکاروں کا صحیح عکس دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا تو آج دنیا بھر میں آرٹ و ادب کا ہماری بارے میں خیال مختلف ہوتا ہے۔

اسلام میں خطاطی کا نہ صرف ایک بلند مقام ہے بلکہ اس نے معاشرہ میں ایک اہم رول بھی ادا کیا ہے۔ فنکاری کی یہ صنف معاشرہ اور ثقافت کے تمام تر شعبوں میں اثر انداز ہو گئی تھی۔ قرآن کریم سمیت تمام علوم جیسے سائنس، مذہب اور ادب سے متعلق کاموں کی خوبصورتی کے ساتھ خطاطی کی گئی تھی۔ مساجد، منبروں، محلات، قالین، تکیوں، مسندوں، تلواروں، ہیلمیٹ اور یہاں تک کہ سائنٹفک آلہ جات جیسے آفتاب اور ستاروں کی بلندی معلوم کرنے والا آلہ اور گلوب وغیرہ کی خوش نویس ڈیزائن کے ساتھ خطاطی کے توسط سے آرائش کی گئی تھی۔ دلچسپ بات جو کہ حیرت میں مبتلا کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ خطاطی کے فن پاروں کی تخلیق کرنے والے فنکاروں جن کی عالمی سطح پر ستائش کی گئی تھی، وہ سب مرد فنکار ہی نہیں تھے۔ اسلامی کلچر کو فروغ دینے میں خواتین نے بھی بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ بلاشبہ اسلام میں فن خطاطی کا بلند مقام ہے۔ اس نے تہذیب و معاشرت کو جلا بخشنے میں اہم رول ادا کیا۔ گو کہ فن خطاطی کے عروج کی بہت ساری وجوہات ہیں۔ معاشرتی تہذیب کے بہت سارے اسباب ہیں۔ اسلام نے ابتدائی دور سے ہی حصول علم کی حوصلہ افزائی کی اور حصول علم کے لئے خطاطی بنیادی چیز تھی اس کے علاوہ وہ سرکاری اور مذہبی دونوں طرف اپنے حسن کا جلوہ دکھا رہی تھی۔ عربی طرز تحریر اس فن کے اشتراک سے خوبصورت ترین اسکرپٹ ہو گئی تھی۔ مسلم حکمرانوں نے خطاطی کی حوصلہ افزائی کی اور خطاطوں کو اعزاز سے بھی نوازتے رہے، بلکہ خطاطوں کی مسلم حکومتیں معاونت بھی کرتی تھیں۔ مسلم

خطاط مذہبی جذبہ کے زیر اثر ہوتے تھے یا پھر دانشور۔ ان کو معاشرے میں بہت تکریم اور وقار حاصل تھا۔ فنِ خطاطی ہماری مسلم ثقافت کا نہایت تابناک رُخ ہے۔ اس کی اپنی جداگانہ اہمیت کی امین منفرد تاریخ ہے۔ ایک ایسا فن کہ جس نے اپنی دلکش اور جدا جمالیاتی تاریخ مرتب کی ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک کے عجائب گھر مسلم خطاطی کے شاہکاروں سے بھرے نظر آتے ہیں۔ اسلامی خطاطی کے فن پارے مسلمان ممالک کے علاوہ یورپ اور دیگر مسلم ممالک میں بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ جو اس بات کی نشانی ہیں کہ اب مغرب میں خطاطی کو ایک عظیم فن کی صورت میں تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے "شبہ طراز" اپنے مضمون "بن چولہ چوغہ قلندر" میں لکھتے ہیں:

> "تاریخ فنِ خطاطی نادر و نایاب ہے۔ کبھی روایات کو زوال نہیں آتا۔ ان کی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے ۔اس سلسلے میں یہاں یہ مثال بہت بہتر رہے گی کہ بارش کا ننھا سا قطرہ بادل سے ٹپکا، جب اس نے سمندر کی چوڑائی دیکھی تو شرمندہ ہوا، دل میں کہا کہ سمندر کے سامنے میری کیا حیثیت ہے؟ اس کے ہوتے ہوئے میں نہ ہونے کے برابر ہوں۔ جب اس نے اپنے آپ کو حقارت سے دیکھا تو ایک سیپ یعنی صدف نے اسے اپنے منہ میں لے لیا اور دل و جان سے اس کی پرورش کی۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ قطرہ ایک قیمتی موتی بن گیا اور بادشاہ کے تاج کی زینت بنا۔"۳۰

کسی بھی زبان کا رسم الخط ایک زندہ جسم کی مانند تمدن میں نمودار ہوتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اس کی تہذیب و ثقافت کا حصہ بنتا جاتا ہے۔ اس طرح اس سے نہ صرف خیال کا اظہار ممکن ہوتا ہے بلکہ اس کا رسم الخط اپنی قوم کے مزاج اور اس کی سیرت کا عکاس بھی ہوتا ہے۔ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ اور قومی زبان پاکستانی قومیت کے لیے بنیادی ستون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے جہاں رسم الخط اور املا کی اصلاح کی بات ہوتی ہے وہاں اس کے تشخص کو ابھارنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ادب اور فنونِ لطیفہ کا اشتراک بہت ضروری ہوتا ہے۔ فنِ خطاطی کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسانی تہذیب و ثقافت اور روایات کی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ دور میں جو فنکار یا خطاط کام کر رہے ہیں وہ گویا انسانی ثقافت و روایات کو بچانے اور استحکام بخشنے کا

کام سر انجام دے رہے ہیں۔ پرانے دور میں انسان فنِ تحریر سے ناواقف تھا، مگر اشکال سازی سے ناواقف نہ تھا۔ وہ مختلف طرح کی شکلیں بنا کر اپنے احساسات اور جذبات کا اظہار کیا کرتا تھا۔

عوامی سطح پر ترسیل و ابلاغ کی بڑی وجہ انسانی احساسات اور جذبات کا بے ساختہ اظہار ہے۔ اور یہی بے ساختہ پن آج بھی فنِ خطاطی کی مقبولیت کی اہم وجہ ہے۔ فنِ خطاطی اسلامی فنون لطیفہ میں اہم اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کا ارتقاء آج سے ہزاروں برس پہلے ہی ہو گیا تھا۔ اسلام کے نامور خطاطوں کے اہم مجموعے آج بھی دنیا کے برے بڑے عجائب گھروں میں موجود ہیں۔ قطعات ہوں یا قرآنی آیات یا پھر کسی مسجد، عمارت یا منبر پر ثبت آیات، احادیث یا اولیاء کے اقوال اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تمام فن پارے خطاطی کے بغیر نامکمل ہیں۔ فنِ خطاطی کو جتنی شہرت اور ترقی برصغیر پاک وہند سے ملی وہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس فن میں برصغیر پاک وہند نے بڑے بڑے نام پیدا کیے ہیں۔ برصغیر میں اس فن کو جلا بخشنے میں وسط ایشیاء کی ریاستوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ وسط ایشیا کے خطاطوں کی وجہ سے یہ فن صحیح معنوں میں برصغیر پاک وہند میں اپنا نام بنا سکا۔

عصرِ حاضر میں بھی فنِ خطاطی کی ترویج و ترقی کے لیے ماہر خطاط اپنی اپنی حد تک کوشش کرنے میں لگے ہوئے ہیں وہ اپنے فن پاروں کے ذریعے دنیائے فن کے چاہنے والوں کے لیے شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ فنِ خطاطی اور نامور خطاطوں کے کام اور ان کے بارے میں ادب کے قاری کو آگاہ کرنے میں "سہ ماہی ادبیات" نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اکیسویں صدی کے الجھے ہوئے مشینی دور میں یہ رسالہ لوگوں کو اپنے اسلاف کی میراث سے آگاہ کرنے کے فرائض سر انجام دے رہا ہے۔ تاکہ آج جدید نسل فنِ خطاطی کی ضرورت و اہمیت سے واقفیت حاصل کر سکے۔ فن پاروں اور فن کاروں سے متعلق جان کر اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین کر سکیں۔

۲۔ شخصیتِ خطاط پر مضامین:

صادقین ایک فرد کا نام نہیں بلکہ خطاطی کے فروغ میں ایک ہمہ گیر تحریک کا نام ہے۔ بلاشبہ گذشتہ دہائی میں کوئی ایک بھی ایسا نام نہیں ملتا جس نے خطاطی کے فروغ کے لیے اتنی جدوجہد کی ہو۔ پاکستان میں خطاطی کی نشاۃ ثالثہ بلاشبہ صادقین کے قلم کی مرہونِ منت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بے پناہ فنی صلاحیتیں عطا کیں۔ ان فنی

خصوصیات کے ساتھ ساتھ ان کو بہترین ترتیب و تنظیم کا ہنر بھی عطا کیا۔ اگر عصر حاضر میں ان کو "مجدد خطاط" کا لقب دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ "شبہ طراز" اپنے مضمون "بن چولہ چوغہ قلندر" میں لکھتے ہیں:

"صادقین پاکستان کے واحد فنکار ہیں جن کی قرآنی آیات کی خطاطی اور پینٹنگز بین الاقوامی سطح پر اپنی شناخت کرواتی ہیں۔ جب کہ صادقین نے اول اول رباعیاں لکھیں بعد ازاں وہ پینٹنگ میں بالخصوص خطاطی کی جانب مائل ہوئے۔۔۔ صادقین کے کینوس پر کسی جنگل میں گم ہو جانے کا احساس نمایاں ہے۔ کانٹے دار جھاڑیوں سے گزرتے ذہن و دل پر آبلے اور خراشیں نمودار ہوتی رہتی ہیں۔۔۔ صادقین نے قرآن مجید کی آیات کی جس خاص انداز میں خطاطی کی وہ صرف انہی کا خاصہ ہے۔ بالخصوص اس میں سورہ رحمٰن کی آیات کی خطاطی کو پاکستانی قوم اپنا سرمایہ افتخار سمجھتی ہے۔"[۳۱]

آپ کا مصورانہ خطاطی میں انداز منفرد تھا۔ صادقین نے پاکستان میں جی بھر کے کام کیا۔ اور بے شمار فن پارے یادگار چھوڑے۔ آپ کو یہ منفرد اعزاز حاصل ہے کہ آپ نے اپنی مصورانہ مقبولیت سے فائدہ اٹھا کر قرآنی خطاطی کو بطورَ فن دنیا کے سامنے پیش کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُمراء و شرفاء نے گھروں سے قرآنی فن پاروں اور خطاطوں کے اہم شاہکاروں کو نکال دیا تھا تو یہ اعزاز صادقین کا ہے کہ وہ دوبارہ اس فن کو گھروں تک لائے اور عوام میں قرآنی خطاطی کو مقبول کروایا۔ صادقین بلاشبہ مصورانہ خطاطی کا سب سے بڑا نام ہیں۔ آپ نے ۱۹۸۷ء میں وفات پائی۔ آپ کا اندازِ خطاطی میں وہ کمال تھا کہ آج تک آپ کی نقل کرنے والے تو بہت سامنے آئے مگر کوئی بھی آپ کے انداز کو ہو بہو اپنا نہیں سکا۔

خطاطی کی دنیا کا بڑا نام طاہر بن قلندر رہے۔ جنہوں نے مصوری کے ساتھ ساتھ خطاطی کو بھی اپنایا۔ ان کے فن پارے تمام جمالیاتی اقدار کے امین نظر آتے ہیں۔ "شبہ طراز" اپنے مضمون "بن چولہ چوغہ قلندر" میں لکھتے ہیں:

"شوخ رنگ پکی روشنائی، چاندی کے اوراق اور دھاتی رنگوں کے امتزاج سے قرآنی سورتوں اور اور آیتوں کو صوفیانہ مزاج سے منور کرنے کے ساتھ ساتھ نئی نسل کی اللہ سے وابستگی کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ بن قلندر کی خطاطی دیکھ کر اور ان سے مل کر یہ خیال دل میں جاگزیں ہوتا ہے کہ صرف برگد کے درخت کے نیچے بیٹھے رہنے سے نرواں حاصل نہیں ہوتا۔۔۔ نہ

صرف اپنی ذات میں الجھنے سے ذاتِ باری تعالیٰ سے آشنائی ہوتی ہے۔ بلکہ زندگی میں رہنے سے، زندگی کو محسوس کرنے اور زندگی کے ساتھ رقص کرنے سے بھی "اس" سے قربت حاصل ہوتی ہے۔"[۳۲]

طاہر بن قلندر کے ہاں خطاطی کی سبھی خصوصیات پورے بانکپن اور نزاکتوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ خطاطی و مصوری کے منفرد فنی اسرار و رموز سے وہ پوری طرح واقف ہیں۔ ان کے خط میں فطری بے ساختگی، منفرد انداز اور خداداد نکھار ہے۔ ان کا فن پارہ دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ دنیا نے طاہر بن قلندر کو ابھی وہ مقام نہیں دیا جس کے درحقیقت وہ اہل ہیں۔ آپ نے نہ صرف انفرادی حروف بلکہ الفاظ کے مجموعے اور ڈھانچے پر بھی خصوصی توجہ دی۔ ایک جمال پرست فنکار کی مانند وہ کسی بھی جمالیاتی قدر اور اس کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔

فن کوئی عام یا معمولی چیز نہیں جو کہ بس بیٹھے بٹھائے حاصل ہو جائے بلکہ یہ ایسی متاعِ گراں بہا ہے جس کے لیے بہت تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ فن کی صحیح دیوی ہر کسی پر مہربان نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ صرف ان عظیم افراد پر اپنا مقدس آنچل ڈالتی ہے جو کہ مصائب و آلام کے کئی پہاڑ سر کر چکے ہوں۔ "شبہ طراز" اپنے مضمون "بن چولہ چوغہ قلندر" میں لکھتے ہیں:

"اپنی خطاطی کی طرح نکھری ہوئی شخصیت کے مالک طاہر بن قلندر نے سورہ الرحمٰن، سورہ الکوثر، آیت الکرسی، درود پاک، نادِ علی، چاروں قل، سورہ فاتحہ اور بہت سی آیات کو کینوس پر منتقل کیا ہے۔ بولڈ انداز میں کھینچی گئی قوسوں اور دائروں سے ایک حسین منظر بن جاتا ہے۔ جیسے رات اور دن آپس میں مل رہے ہوں، کہیں آسمان زمیں پر اترتا دکھائی دیتا ہے۔ کبھی تاریکی روشنی میں ضم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اور کہیں خزاں بہار میں ڈھلتی دکھائی دیتی ہے۔"[۳۳]

طاہر قلندر خطاطی کی دنیا کا ایک ابھرتا ہوا نام ہے۔ آپ کے فن پاروں کو دیکھ کر یہ کہنا بے جا نہ ہو گا جو کام کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے میں فنکاروں کی عمریں بیت جاتی ہیں وہ کام آپ نے نہایت کم عمری میں کر دکھایا۔ مسلسل محنت اور کوشش سے دنیا کے سامنے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ آپ نے ایسے نایاب اور منفرد فن

پارے تخلیق کیے کہ رہتی دنیا تک ان فن پاروں کی وجہ سے ناقدینِ فن آپ کی صاحیتوں کے گن گاتے رہیں گے۔

دنیائے خطاطی کا ایک اور درخشاں ستارہ آفتاب ظفر جنھوں نے نہ صرف مصوری بلکہ خطاطی میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ آپ کا شمار ملک کے صفِ اول کے خطاطوں میں ہوتا ہے۔ آپ کے ہاتھوں میں جدت بھی ہے اور قدرت بھی، آپ کے حظ میں بانکپن اور حسن و جمال نمایاں نظر آتے ہیں۔ آپ طبعیتا بہت حساس تھے۔ آپ کے فن میں آفاقی سچائی اور حقیقیت کے اعتراف و تاثرات کا جذبہ نمایاں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خطاطی اور مصوری کے ذریعے آفاقی سچائی اور حقائق کے مطابق اسلامی تصویر کشی کرنے کا فن عطا کیا۔

آفتاب ظفر بنیادی طور پر خطی مصور تھے۔ خطی مصوری میں مصور اس طرح خطاطی کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ مطلوبہ شے بنا دیتے ہیں۔ اگر یہ آرٹ آیاتِ قرآنی کی صورت میں ہو تو جلال و جمال کو مختلف رنگوں سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس میں خطوط کے لیے باقاعدہ کوئی قانون مقرر نہیں ہوتا بلکہ مصور حضرات اپنی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خود الفاظ کی ترتیب و تنظیم کر لیتے ہیں۔ "انجم جاوید" اپنے مضمون "آفتاب اقبال" میں لکھتے ہیں:

> " آفتاب ظفر ۱۴۰۰ سالہ اسلامی تاریخ میں پہلے مصور ہیں جنہوں نے قرآنی آیات کا تصویری ترجمہ کیا ہے۔ ان کی کیلی گرافی میں یہ خوبی بھی سامنے آتی ہے کہ آپ نے قرآنی آیات واضح سمجھ میں آنے والی عربی میں لکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے ترجمے کو اردو اور انگریزی زبان میں تحریر کرنے کے ساتھ ساتھ ان قرآنی آیات کی تشریح و وضاحت کے لیے اسے پینٹنگز کا روپ دے دیا۔ جس میں زیر، زبر، پیش اور دیگر جزیات کا بھی خیال رکھا گیا۔"[۳۴]

آپ خطاطی میں اپنا تخیل مخمور کیا کرتے تھے۔ اس تخیل کے زیرِ اثر آپ کا قلم ایسے ایسے شاہکار تخلیق کرتا کہ دیکھنے والا داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ آج بھی خطاطی کی تاریخ کے سنہری اوراق اپنی پر کشش جبینوں پر ان کے شاہکاروں کے جھومر سجائے اپنے مقدر پر رشک کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

د۔سنگ تراشی:

سنگ کے معنی ہیں پتھر جبکہ تراشی سے مراد کندہ کاری، یعنی پتھر سے نقش و نگار بنانا۔ سنگ تراشی کا مواد صرف پتھر ہی نہیں بلکہ سنگِ مرمر دھات، چکنی مٹی، اور لکڑی بھی اس میں شامل ہے۔ چونکہ اس کام کا آغاز پتھر سے ہوا اس لیے اس کا نام سنگ تراشی رکھ دیا گیا۔ مٹی اور دھاتی پتھروں کو سنگ تراشی میں اہم مقام حاصل ہے۔ پتھروں کے علاوہ یہ تمام مواد بتوں کو بنانے اور سنوارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سنگ تراشی کے مختلف نمونے ہیں حسِ مذاق کے جدا ہونے کی وجہ سے یہ نمونے مختلف انداز میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بنیادی طور پر ان نمونوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

ا: نقلی سنگ تراشی ۲: ذہنی سنگ تراشی

ان میں نقلی سنگ تراشی میں کسی زمانے میں موجود نمونوں سے متاثر ہو کر صرف ان کی نقل اتاری جائے۔ جبکہ سنگ تراشی میں ایسے نمونے شامل ہوتے ہیں جو کہ کسی سنگ تراش کی اپنی ذہانت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس قسم کی فن سنگ تراشی میں کثرت دکھائی دیتی ہے۔ مذہب میں اللہ تعالیٰ کو سب سے معتبر مانا جاتا ہے۔ کہ اور لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی محبت و احترام میں مختلف طرح کے مجسمے بنائے۔ سنگ تراشی کو عمومی طور پر قدرت کی نقل کہا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ سنگ تراشی قدرت کی نقل نہیں ہے بلکہ خالص انسانی دماغ اور دل کا اجتہاد ہے کیونکہ قدرت میں کوئی سنگ تراشی کا نمونہ نہیں پایا جاتا۔ البتہ ایسا ممکن ہے کہ سنگ تراشوں نے انسانی یا حیوانی اشکال سے کچھ اشکال یا مجسموں کا عکس لیا ہو، جیسے کسی نایاب بت کو بنانے کے لیے انسان کے جسمانی اعضاء کا عکس لیا ہو قد و قامت کو دکھانے کے لیے کسی بلند درخت یا عمارت کا خاکہ کھینچا ہو۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ سنگ تراشی قدرت کی نقل نہیں ہے بلکہ اس کے لیے کہا جائے گا وہ انسان کے دماغ کی تخلیق ہے۔ کیونکہ فن دماغ سے نکلا ہے اس لیے اسے فنِ لطیفہ کہا گیا ہے۔

سہ ماہی ادبیات میں سنگ تراشی کے ضمن میں شائع ہونے والے منتخب مضامین یہ ہیں: "خیال کے رنگوں کا شہر" از طارق شاہد (شمارہ ۵۲، ۲۰۰۰ء)، "بن چولہ چوغہ قلندر" از شبہ طراز (شمارہ ۹۶، ۲۰۱۲ء)، "حفظ محمد یوسف سدیدی" از احمد شاہ (شمارہ ۹۷، ۲۰۱۲ء)، "مخدوم صادق حسین ایک تصوراتی وجود" از حمزہ ابنِ وصی (شمارہ ۱۲۶، ۱۲۷، ۲۰۲۰ء)، "آرٹ کیا ہے" از نسیم نیشوز (شمارہ ۹۸، ۲۰۱۳ء)، "مسعود کوہاری کا فن سنگ

تراشی" از عباس شاہ (شمارہ ۱۰۲، ۲۰۱۲ء))، "استاد اللہ بخش" از شفقت علی جاوید (شمارہ ۲۰۱۳،۱۰۴ء)۔ مذکورہ مضامین کے مطالعے و تجزیے سے یہ بات اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ مضمون نگاروں نے فنِ سنگ تراشی پر مضمون لکھتے ہوئے مذکورہ فن کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں اور ان کے اثرات کی وسعت کو ملحوظ رکھا ہے۔

ا۔ سنگ تراشی کی روایت کے مضامین:

ارتقائے انسان کے کلینڈر کو اگر پرکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وقت کی ہر کروٹ میں سنگ تراشی کی صلاحیت موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تصویر سازی انسان کی بنیادی حس ہے۔ جب وہ جنگلوں میں رہتا تھا تو اس کے پاس رہنے کے لیے گھر نہ تھے تب بھی سنگ تراشی کہیں نہ کہیں اس کی سماجی ضرورت تھی۔ ماہرین کے مطابق قدیم انسان مافوق الفطرت عناصر پر قابو پانے کے لیے سنگ تراشی کا سہارا لیا کرتا تھا۔ ہمیں جہاں جہاں انسانی بستیوں کا وجود دکھائی دیتا ہے وہاں وہاں ہمیں کسی نہ کسی طرح انسان اور سنگ تراشی کا وجود دکھائی دیتا ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا معاشرے میں بھی بدلاؤ آتا گیا مگر معاشرے کے بدلاؤ سے فن میں تبدیلی نہیں آئی بلکہ ہر دور میں معاشرے میں کہیں نہ کہیں اس کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ انسان میں یہ تبدیلی آئی کہ اس نے سنگ تراشی کو صرف مافوق الفطرت عناصر پر قابو پانے کے لیے استعمال کرنے کی بجائے اس فن کو جدید تقاضوں سے روشناس کروایا۔ مثلاً مصر کی تہذیب میں فرعون اور اس کی ذات سے منسلک جو معاشرہ قائم کیا گیا اس میں پتھروں سے تراش کے رکھے گئے اجسام نمایاں اہمیت رکھتے تھے۔ آج ہم اس دور کے افراد اور معاشرے کو ان کے رہن سہن اور طور طریقوں کو سنگ تراشی اور فنِ تعمیر کے بغیر نہیں سمجھ سکتے۔ اس دور کے سنگ تراش ہمیں سماجی روابط، سیاسی ڈھانچے، معاشرتی اقدار، رہن سہن کے طریقے، لباس اور طبعی ماحول کو بڑے دلکش انداز میں بیان کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ سنگ تراشی اپنے معانی زندگی میں تلاشتی ہے اور کسی حد تک زندگی بھی سنگ تراشی کو معنی دیتی ہے۔ سنگ تراشی یا کوئی بھی آرٹ زندگی کے ہونے کی وجہ بتاتا ہے۔ پھر ثانوی سطح پر زندگی کے وجود کے اسباب کا پتہ دیتا ہے۔ فنِ سنگ تراشی ہو شبہ گری یا مجسمہ سازی تمام فنون کی دنیا میں یکساں اہمیت ہے۔ فنکار اپنے دن رات کی محنت سے اپنے خیالات کو خوبصورت سانچے میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ مثلاً ایک معمولی پتھر جو بظاہر ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا مگر جب یہ ایک فنکار کے ہاتھوں میں آتا ہے تو خوبصورت سانچوں میں ڈھل جاتا ہے جس کو دیکھتے ہی انسان خوشی اور مسرت کے احساس

میں گھِر جاتا ہے۔ایک فنکار کی فنکارانہ صلاحیتیں ایک بے مول پتھر کو انمول بنا دیتی ہیں۔اس ضمن میں "عباس شاہ" اپنے مضمون "مسعود کوہاری کا فن سنگ تراشی" میں لکھتے ہیں:

> " انسان کا زمین ،اس کی موجودات اور رنگوں سے تعلق بہت گہرا اور پرانا ہے۔یہ تعلق بالکل ایک ماں اور بچے کے رشتے کی مانند ہے جیسے بچہ مٹی کو چھو کر جھوم اٹھتا ہے اس سے ایسے ملتا ہے جیسے ماں سے ملتا ہے۔مٹی سے جس چیز کو بنایا گیا۔ اس سے انسان کی محبت فطری ٹھہری۔اس تخلیق نے ہر آنے والی انسانی تہذیب کے لیے راستے متعین کیے۔یعنی کہ مٹی ہی انسانی تہذیب کے جنم کی وجہ بنی۔ایسی تہذیب سے انسان کے اندر موجود فنکار وں نے جنم لیا۔وہ فنکار پھر کبھی معدنی گوشوں تک پہنچا تو کبھی وہ شیشہ ،چمڑا، کاغذ، کپڑا تک اور ایسی بے شمار چیزوں سے نئی نئی تخلیقات کرنے لگا۔"۳۵

۲۔ شخصیتِ سنگ تراش پر مضامین:

ایسے ہی فنکاروں میں ایک نام مسعود کوہاری کا ہے۔بنیادی طور پر آپ ایک مصور تھے۔اپنے فن کا آغاز مصوری سے کیا مگر انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ وقت کے ساتھ ایک شے سے اکتا کر دوسرا مقام تلاش کرنے لگتا ہے۔ایسے کوہاری کو بھی اپنی تخلیقات کے با قاعدہ اظہار میں کمی محسوس ہوئی جس کی وجہ سے وہ دوسرے فنون میں دلچسپی لینے لگا۔"عباس شاہ" اپنے مضمون "مسعود کوہاری کا فن سنگ تراشی" میں لکھتے ہیں:

> "کوہاری نے شیشے، پتھر اور مختلف دھاتوں کو یکجا کر کے عجیب وغریب اور حیرت انگیز کام کی تخلیق کی۔یعنی اس زمین کی تہہ میں موجود ایک نازک شے شیشے کو تو کبھی پتھر کو اپنے خونِ جگر سے گوندھ کر اسے بھٹی سے نکالا۔پھر اس میں اپنے مزاج کے رنگ شامل کیے کہ ہمارے سامنے شفاف مجسمے کی نئی جہت آئی جو آئندہ آرٹسٹ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔"۳۶

کوہاری کا تعلق پنجاب سے تھا اور اسی سرزمین پر اس نے اپنے فن کی بدولت اپنا نام بھی بنایا۔کوہاری کا فن گوجرانوالہ اور گجرات کو ظروف سازوں میں مشہور کر چکا ہے۔اس کے علاوہ آپکی زندگی کا بڑا حصہ گجرات کی بھٹیوں کے ساتھ گزرا جو کہ آپ کی فنکارانہ زندگی کے لیے نعمت ثابت ہوا۔"حمزہ حیدر" اپنے مضمون "فن سنگ تراشی" میں اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

"مٹی کی روح یعنی دھات سے کھیلنا کوئی آسان کام نہیں۔ ذراسی لاپروائی سے بناہوا جسم چکنا چور ہو سکتا ہے۔ اس میڈیم سے سرگوشی کا مطلب آپکا اپنے آپ سے سامنا ہے۔ اس کی پاکیزگی سے تمام قدرت منسلک ہے۔ جو بظاہر معمولی پتھر ہے لیکن اصل میں سب کچھ ہے"[۳۷]

سنگ تراشی ایک قدیم فن ہے اور اس کے ماہر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس میں جدت اور تبدیلیاں لا رہے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں گندھارا آرٹ سنگ تراشی کے ترقی اور عروج کی بہترین مثال ہے۔ مغل بادشاہوں کی فنونِ لطیفہ میں دلچسپی اور فنکاروں کی مالی و فنی معاونت اس خطے میں فنون کی ترقی کی اہم وجہ بنی۔ دوسری طرف زمانے کی تیز رفتار ترقی، سہولتوں اور جدید سازو سامان اس فن کی ترقی کی راہ میں حائل ہوا۔ ایک وقت تھا جب پتھروں پر کئی کئی مہینوں تک محنت کر کے ان سے شاندار فن پارے بنائے جاتے تھے جن میں ہاتھوں کی کاریگری کی واضح جھلک دیکھنے کو ملتی تھی۔ مگر بدلتے وقت اور حالات نے اس فن کو بری طرح متاثر کیا۔ اور وہ کاریگر کی ہاتھوں کی محنت سے مشینوں پر منتقل ہو گئے۔ اب وہی کام سنگ مرمر اور دیگر مصنوعی ٹائیلوں پر مختلف مشینوں اور کمپیوٹر گرافکس کی مدد سے با آسانی ہو جاتا ہے۔ سنگ تراشی ایک کل وقتی اور انتہائی محنت طلب کام ہے جس میں ایک مجسمے کو بنانے میں ہفتے اور مہینے لگ جاتے ہیں۔ تاہم نئی تکنیکی سہولیات نے اس فن کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ جدید مشینوں نے جہاں اس فن میں جدت لا کر آسانی پیدا کی ہے وہیں کاریگروں کے ہاتھ سے بنے شاہکاروں سے عوام کو محروم کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ سنگ تراشی مسلمانوں کا عظیم ورثہ ہے کیونکہ قدیم دور سے لے کر آج مسلمانوں کی اس فن کے ضمن میں بہترین فنکارانہ صلاحیتوں کو دنیا جانتی ہے۔ مگر اس کی ایجاد کا سہرا بدھ مت کے سر ہے۔ "حمزہ حیدر" اپنے مضمون "فن سنگ تراشی" میں لکھتے ہیں:

"مجسمہ سازی اور پتھروں کے فن پارے تخلیق کرنے کے عمل کی ابتداء گندھارا آرٹ سے ہوئی جس کے بانی بدھ مت کے پیروکار اور یونانی تھے"[۳۸]

قدیم بدھ مت میں عبادت کے مجسمے چونے سے بنائے جاتے تھے۔ آسٹریا سے دریافت ہونے والا ساڑھے چار انچ کا مجسمہ دنیا کا سب سے قدیم مجسمہ تصور کیا جاتا ہے۔ جس کا نام وومن آف ولینڈرف (women of Willandraf) رکھا گیا۔ اس کے بعد باقاعدہ طور پر پتھروں سے مجسموں کی تخلیق شروع کر دی گئی۔ پھر

بدلتے وقت اور حالات نے اس فن کو عروج بخشا۔ اور دنیا کی تقریباً تمام اقوام نے کسی نہ کسی صورت میں اس فن سے استفادہ کیا۔ کہیں پتھروں سے مجسمے بنائے گئے تو کہیں برتن، کہیں فنِ تعمیر کے شاہکار تو کہیں زیورات، فنکاروں کی پتھروں سے بنی منفرد تخلیقات کو پوری دنیا میں مقبولیت اور دوام حاصل ہوا۔ اگرچہ آج کے دور میں اس فن کی مقبولیت میں کمی آئی ہے مگر ماضی کے وہ فنکار جنہوں نے شب و روز کی محنت سے اس فن کو دنیا کے سامنے متعارف کروایا ان کے نام کو کبھی بھلایا نہ جاسکے گا۔ ان کا فن آتی نسلوں میں بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ طارق شاہد، خیال کے رنگوں کا شہر (مضمون) ادبیات، شمارہ نمبر ۵۲، ۲۰۰۰ء اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۲۲۴

۲۔ ایضاً، ص: ۲۲۴

۳۔ ایضاً: ص ۲۲۵

۴۔ انجم جاوید، آفتاب اقبال (مضمون)، ادبیات، شمارہ ۱۰۲، ۲۰۱۲ء اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص: ۲۱۹

۵۔ ایضا، ص ۲۲۰

۶۔ انجم جاوید، وصی حیدر کی مصوری، (مضمون)، ادبیات، شمارہ ۹۷، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۲۷۲

۷۔ ایضاً ص ۲۷۳

۸۔ ایضاً ص ۲۷۴

۹۔ ایضاً ص ۲۷۲

۱۰۔ حمزہ ابنِ وصی، مخدوم صادق حسین ایک تصوراتی وجود، (مضمون)، شمارہ ۱۲۷، ۱۲۶، اکتوبر تا مارچ ۲۰۲۰ء اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۳۲۶

۱۱۔ حمزہ حیدر، چترا پریتم، (مضمون)، ادبیات، شمارہ ۹۸، جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۲۴۸

۱۲۔ ایضاً ص ۲۴۸

۱۳۔ طارق شاہد، خیال کے رنگوں کا شہر (مضمون) ادبیات، شمارہ نمبر ۵۲، ۲۰۰۰ء اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۲۲۳

۱۴۔ ایضاً ص ۲۲۴

۱۵۔ یاسر اقبال، دھرپد سے غزل تک (مضمون)،ادبیات، شمارہ ۱۰۳،اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴ءاکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد، ص ۱۳۴

۱۷۔ انعام ندیم، کلاسیکی موسیقی میں گھرانوں کا نظام (مضمون) ادبیات، شمارہ ۱۰۰،جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ءاکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد، ص ۴۵۴

۱۸۔ ایضاً ص ۴۴۴

۱۹۔ انعام ندیم، ریشماں (مضمون) ادبیات، شمارہ ۱۰۲،جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد ص ۲۱۶

۲۰۔ ایضاً ص ۲۱۷

۲۱۔ احمد سلیم سلیمی، جدید شناشاعری، گائیکی اور شنا کی مفلسی (مضمون) شمارہ ۱۲۵،مارچ تا جولائی ۲۰۲۰ء اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد، ص ۱۲۲

۲۲۔ بدر الزماں، ملکہ کافی زاہدہ پروین، (مضمون)،ادبیات، شمارہ ۱۰۲،جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ءاکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد، ص ۱۲۲

۲۳۔ نثار ترابی، ڈاکٹر، نثار بزمی، (مضمون) ادبیات، شمارہ ۱۰۰،جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد، ص ۴۴۸

۲۴۔ ایضاً ص ۴۴۷

۲۵۔ عقیل عباس جعفری، خواجہ خورشید انور، (مضمون) ادبیات، شمارہ ۹۶،جولائی تا دسمبر ۲۰۱۲ءاکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد، ص ۱۳۵

۲۶۔ ایضاً ص ۱۳۶

۲۷۔ ایضاً ص ۱۳۶

۲۸۔ ایضاً ص ۱۳۷

۲۹۔ طارق شاہد، خیال کے رنگوں کا شہر (مضمون) ادبیات، شمارہ نمبر ۵۲، ۲۰۰۰ءاکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۲۲۳

۳۰۔ شبہ طراز، قلندر بن چولہ چوغہ،(مضمون)،ادبیات، شمارہ۹۶،جولائی تادسمبر ۲۰۱۲ء،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد، ص۱۴۴

۳۱۔ ایضاً:ص۱۴۶

۳۲۔ ایضاً:ص۱۴۵

۳۳۔ ایضاً:ص۱۴۶

۳۴۔ انجم جاوید، آفتاب اقبال(مضمون)،ادبیات، شمارہ۱۰۲، ۲۰۱۲ءاکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد، ص:۲۲۱

۳۵۔ عباس شاہ، مسعود کوہاری کا فنِ سنگ تراشی، شمارہ۷۶، جون تا اکتوبر ۲۰۰۷ءاکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد، ص۲۴۱

۳۶۔ ایضاً:ص۲۴۲

۳۷۔ حمزہ حیدر، فن سنگ تراشی، ،(مضمون) ادبیات ،شمارہ ۹۶ ،جولائی تا دسمبر ۲۰۱۲ء اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد، ص۱۴۰

۳۸۔ ایضاً:ص۲۴۳

باب چہارم

مجموعی جائزہ، تحقیقی نتائج اور سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ

جمالیات کا تعلق جبلتِ انسانی کے طلب اور جستجو والے اُس گوشے سے ہے جس نے انسان کو غاروں سے نکال کر اَس کائنات کی رنگارنگی اور خوبصورتی کی طرف گامزن کیا ہے۔ اور ایک ایسا سماج بنانے کی تحریک دی جو مسلسل ترقی کا سفر طے کیے ہوئے ہے جمالیاتی ترقی کی روایت ہمیشہ انسانی جمالیاتی شعوری ترقی کی روایت پر قائم رہی ہے۔ جمالیات کا تعلق براہ راست انسانی جذبات واحساسات سے منسلک ہے۔ ہر عہد کے ادب نے فنونِ لطیفہ کی مختلف صورتوں میں انسانی جمالیاتی شعور کی نہ صرف عکاسی کی ہے بلکہ اس کی روایت کو آگے بھی بڑھایا ہے ۔جمالیات فلسفے کی وہ شاخ ہے جو حسن اور اس کے متعلقات پر بات کرتی ہے۔ جس کا منصب یہ تھا کہ فنونِ لطیفہ کی جانچ پڑتال کر کے ان اقدار کی نشاندہی کرے جنہیں کسوٹی تسلیم کیا جا سکے ۔ ذوقِ سلیم سے بحث کرے۔ جمالیات کے ماہرین نے فنونِ لطیفہ اور جمالیات کو لازم وملزوم قرار دیا ہے۔ بعض مفکرین نے فنونِ لطیفہ اور جمالیات کو ایک ہی سکے کے دورُخ قرار دیئے ہیں۔

جمالیاتی تنقید نے ہر عہد اور ہر تہذیب کے فرد کی حسِ جمالیات کو نکھارا ہے۔ یوں فنونِ لطیفہ پر جمالیاتی تنقید نے ہر عہد کے انسانی معیارات کے مطابق تراش خراش کے عمل کو یقینی بنایا ہے۔ جمالیاتی تنقید انسانی جذبات واحساسات کی تنقید کا نام ہے۔ وہ احساسات وجذبات جو سماج میں مثبت فنکارانہ اثرات مرتب کرتے ہیں۔ جمالیاتی تنقید انسان کو کسی بھی شے کے خوبصورت اور بدصورت پہلوؤں کو پرکھنے اور سمجھنے کا شعور عطا کرتی ہے۔ یوں انسان ان مسرت بخش اور مفید اظہارات کو سامنے لے کر آتا ہے۔ جو سماج کے لیے سود مند ثابت ہوتے ہیں۔ ادب کا خالق چونکہ انسان ہی ہے اور ادب انسان ہی کے گرد گھومتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمالیاتی تنقید ایک ادیب

سے ایسے ادب کے تخلیق کیے جانے کا مطالبہ کرتی ہے جو جمالیاتی اقدار کا پاس رکھتے ہوئے ایسے فن پارے منظر عام پر لائے جن میں احساسِ حسن کے بھرپور اظہار کے ساتھ مسرت کا پہلو بھی شامل ہو۔ ان خصوصیات کے بر عکس فن پاروں کو جمالیاتی تنقید قبول نہیں کرتی کیونکہ اس کے نزدیک انسان، سماج، قوم و تہذیب کی حقیقی ترقی جمالیاتی حسن و شعور کی ترقی پر منحصر ہے۔

ہندوستانی جمالیات کے ارتقائی سفر پر نظر ڈالی جائے تو یہ بہت سے مذہبی اور رسوماتی رکاوٹوں کا شکار رہا ہے۔ لیکن جمالیاتی تنقید ایک طویل دشوار عہد کے بعد ہند مسلم سلاطین کے عہد میں فنِ تعمیر اور فنِ شاعری کے ساتھ مصوری کو بھی باقاعدہ متعارف کروانے میں کامیاب ٹھہرتی ہے۔ یوں جمالیاتی تنقید ہندوستان کے مختلف ادوار میں حسِ انسانی کو مثبت بنیادوں پر بدلنے میں اور فنونِ لطیفہ کے میدان کو وُسعت بخشنے میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ جس کے انتہائی سود مند اثرات بعد میں ادبی منظر نامے میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جس میں ہر طرح کی مذہبی، رسوماتی رکاوٹوں سے بالاتر ہو کر ہند کلچرائی فنون لطیفہ اپنی انتہائی ترقی یافتہ صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے، جو قیامِ پاکستان کے بعد بھی اپنی جمالیاتی وسعت پذیری کو برقرار رکھنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔

فنونِ لطیفہ اور قدرتی عوامل و مظاہر میں سے ذرے ذرے کی شناخت جمالیات کے بغیر ناممکن ہے۔ ماہرینِ جمالیات کے مطابق کسی چیز کا پہلا تخلیق کار خدا ہوتا ہے۔ یعنی کہ جمالیات خدا اور اس کے مظاہر کی پہچان کا نام ہے۔ ایک ادیب نہایت عمدہ طریقے سے اپنے خیالات کی ترسیل سے دوسروں میں احساس بیدار کرتا ہے۔ جس طرح آواز میں توازن و ترتیب، اشارے اور ادب کی تخلیق کا ذریعہ ہے بالکل اسی طرح آواز کا حسن موسیقی جسمانی حرکات کا حسن رقص اور رنگوں کا حسن مصوری کو جنم دیتا ہے۔ فنونِ لطیفہ انسانی اور سماجی گھٹن کا انخلاء کرتا ہے۔ اور ایسی غلطیوں کی نشاندہی کرتا ہے جو معاشرتی بگاڑ کا سبب بنتی ہیں۔ یوں فنونِ لطیفہ انسان کی بگڑی ہوئی حالت کو نہ صرف درست کرتا ہے بلکہ اسے سماج کا بہتر فرد بنا کر سماجی ترقی کی ضمانت بھی دیتا ہے۔ ادب اور فنونِ لطیفہ کا کام ہی دراصل انسان کو عصبیت، گروہ بندی، تفرقہ پروری اور شدت پسندی سے

نکال کر ایک ایسے پُر امن اور خوبصورت سماج کے تشکیل کی تحریک دینا ہے، جہاں وہ نہ صرف اپنی حسِ جمالیات کی تشنگی دور کر سکے۔ بلکہ ایک بہترین ترقی یافتہ معاشرے کا قیام بھی کر سکے۔

اردو ادب نے جمالیاتی اقدار کو فنونِ لطیفہ کی مختلف صورتوں میں اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس ضمن میں اصناف اردو ادب میں مضمون نگاری نے فنونِ لطیفہ کی پیش کش میں بہت منفرد کردار ادا کیا ہے۔ فنونِ لطیفہ کی جمالیات کا اظہار رسائل میں مضمون نگاری کے حوالے سے زیادہ مؤثر اور کار آمد ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ اس کا اظہار شاعری کی پیچیدگیوں کی بجائے اشاروں، کنایوں میں نہیں بلکہ عام فہم انداز میں کیا جاتا ہے۔ جمالیاتی نظریے کے مطابق بھی انسانی جمالیاتی شعور کی آگاہی جتنی براہ راست اور عام فہم زبان میں ہوگی اتنا سماج اور انسانی شعور کے لیے بہتر ہے۔ نثر (مضمون نگاری) کا اظہار چونکہ براہ راست عام وخاص سے ہوتا ہے اسی لیے اس کی دسترس آسان اور درست ہوتی ہے یہی وجہ ہے زیرِ نظر مقالہ میں فنون لطیفہ کے حوالے سے منتخب رسائل میں مضمون نگاری کو اہمیت دی گئی ہے۔ درجہ بالا منتخب رسائل میں فنکاروں، مصنفوں نے مضمون نگاری میں اپنے آسان، سادہ اور عام فہم اسلوب میں مقامی و عالمی جمالیاتی اقدار اور فنون لطیفہ کو متعارف کرانے اور عوامی شعور میں اس کا صحیح فہم اُجاگر کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے اس مقالے میں منتخب رسائل کے ضمن میں صرف مضمون نگاری ہی کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ادبی رسائل نے سماجی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی ومقامی معیارات کو نہ صرف مختلف فن پاروں میں سمویا ہے بلکہ قارئین کے انہی معیارات پر شعور و آگہی کے لئے بہتر مواقع بھی فراہم کیے ہیں۔ زیر نظر تحقیقی مقالے میں "سہ ماہی سیپ" اور "سہ ماہی ادبیات" کے حوالے سے مقامی و عالمی جمالیاتی تناظرات کو سامنے رکھتے ہوئے مضمون نگاری کے ضمن میں مصوری، موسیقی، خطاطی اور سنگ تراشی کی نہ صرف اہمیت و افادیت کو سامنے لایا ہے بلکہ معاصر ادبی صورتحال میں دونوں رسائل کی کارکردگی کو پیش کرتے ہوئے فنون لطیفہ کی ترویج وترقی کے لئے آئندہ کے لئے لائحہ عمل بھی سامنے لایا ہے۔

"سہ ماہی سیپ" نے فنون لطیفہ کے فروغ میں منفرد کردار ادا کیا ہے جہاں تک "مصوری" کا تعلق ہے تو مصوری اور مذہب کے موضوعات پر مباحث کر کے ذہنی کشادگی کا سامان پیدا کیا ہے۔ مصوری کی تاریخ پر مستند

مصنفین کے مضامین پیش کر کے مصوری کی اہمیت وافادیت کو مسلم کلچر میں پزیرائی بھی بخشی ہے۔اہم مصورین جن میں پبلو پیکاسو، بہزاد،مائیکل اینجلو،صادقین، کی نہ صرف "مصوری" کے حوالے سے گراں قدر خدمات کو سامنے لایا ہے بلکہ ان کے فن کے جمالیاتی تناظرات کو بھی پیش کیاہے۔"سیپ" نے مصوری کے بعد "موسیقی" کی اہمیت وافادیت اور اس کا سماج اور انسان سے تعلق کو مدلل انداز میں پیش کیاہے۔موسیقی کی تاریخ،اس کا سماج میں مقام،انسان اور موسیقی کی جذباتی ہم آہنگی اور موسیقی کے ذریعے جذبات کے انخلا جیسے موضوعات کو مستند مصنفین جن میں ڈاکٹر جواز جعفری،سلطان احمد، عقیل عباس جعفری وغیرہ کے ذریعے سے پیش کیا ہے۔ان کے مطابق موسیقی اور اس سے انسان کا جذباتی ہم آہنگ ہونا یہ جبلتِ انسانی میں شامل ہے اس کی نفی نہیں کی جاسکتی۔ موسیقی اور مذہب پر مختصر مباحث کر کے فرد کی جمالیاتی اقدار کو بیدار کر کے اسے فنون لطیفہ میں دلچسپی پیدا کرنے کا سامان پیدا کیاہے۔

دیگر فنون لطیفہ کے جمالیاتی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے ساتھ "سہ ماہی سیپ" نے "خطاطی" کے جمالیاتی تناظرات کو بھی سامنے لایاہے۔اس ضمن میں جو مضامین "سہ ماہی سیپ" نے "خطاطی" اور فن خطاطی کے حوالے سے پیش کیے ہیں ان کی اہمیت وافادیت فنون لطیفہ کے حوالے سے مسلم ہے۔خطاطی کی تاریخ پر نظر دہرائی جائے تو اس کا سہرہ مسلم سلاطین کے ادوار سے جاملتاہے مسلمانوں نے فن خطاطی میں خوب عروج حاصل کیا اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لیے مصورانہ خطاطی کا آغاز کیا جس میں کسی جاندار سے مشابہت نہیں ہوتی تھی لیکن اس کی خوبصورتی اور جمالیاتی ذوق اپنی مثال آپ تھا۔فن خطاطی کو زیادہ عروج مغلیہ دور میں حاصل ہوا اس کے علاوہ مشہور خطاط کا ذکر بھی یہاں دیکھنے کو ملتاہے جنہوں نے فن خطاطی اور اس کے جمالیاتی پہلوؤں کو آگے بڑھایا یوں مغلیہ دور کے بعد سے لے کر قیام پاکستان اور اب تک فن خطاطی نے اپنا مقام بنائے رکھا ہے یہاں "سیپ" نے خطاطی کے انہیں جمالیاتی پہلوؤں کو سامنے لایاہے۔"سنگ تراشی" کا فن بہت پرانا ہے فنون لطیفہ میں اس کی اہمیت اپنی جگہ اہم مقام رکھتی ہے "سیپ" میں اس حوالے سے بہت زیادہ کام دیکھنے کو نہیں ملتا لیکن جو مضامین اس ضمن میں ملتے ہیں وہ بہت اہمیت کے حامل ہیں "سنگ تراشی" کی تاریخ قدم بدھ مذہب اور

ہندوازم کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔فنون لطیفہ نے سنگ تراشی کے اس جمالیاتی شعور کو ہر دور میں نکھارا ہے یوں آہستہ آہستہ سنگ تراشی بت گری سے مختلف اشکال میں ڈھلنا شروع ہو گئی جس میں خوبصورت ظروف ،ڈیکوریشن پیسز وغیرہ اہم ہیں۔سنگ تراشی کا یہی جمالیاتی شعور مسلم اقوام کے ہاں بھی پہنچنے لگا یوں مسلم اقوام نے بھی بت گری کے علاوہ اس فن کی ترقی میں بہت گراں قدر کردار ادا کیا۔

زیرِ نظر تحقیقی مقالے کے دوسرے منتخب رسالے "سہ ماہی ادبیات" نے فنون لطیفہ کے فروغ میں نمایاں اور گراں قدر کردار ادا کیا ہے۔اس ضمن میں ادبیات نے فنون لطیفہ اور جمالیاتی ذوق کی بیداری میں "سیپ" سے قدرے منفرد اور نمایاں کارکردگی دکھائی ہے۔"مصوری" کے ضمن میں ادبیات نے نہ صرف مصوری کی تاریخ اور اس کے جائز یا ناجائز ہونے جیسے موضوعات تک ہی خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ معاشرے میں مصوری کی حقیقی اہمیت وافادیت کو تسلیم کرایا ہے۔"مصوری" کے جمالیاتی ذوق کو نہ صرف قارئین میں پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے بلکہ جدید و معاصر صورتحال میں اس کی حقیقی جمالیاتی اقدار کو فنکاروں اور تخلیق کاروں میں بھی متعارف کرایا ہے۔"آج کا مصور" کے عنوان سے ادبیات کے ہر شمارے میں مصوری کے حوالے سے گراں قدر معلومات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ادبیات نے جدید انسان کی جمالیاتی حس کو خوب سمجھا ہے اس کے بیشتر شماروں میں اسی جدید جمالیاتی تناظرات کی پیش کش نے اسے "سہ ماہی سیپ" اور بعض دیگر رسائل سے فنون لطیفہ کی پیش کش کے حوالے سے ممتاز مقام عطا کیا ہے۔فنِ مصوری کے پیمانے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں یہی وجہ ہے مصوری ہر دور کے انسانی جمالیاتی شعور کے حوالے سے نئے پیمانے لے کر آتی ہے ادبیات نے ان نئے پیمانوں کو خوب سمجھتے ہوئے فن مصوری کی تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے تشکیلِ جدید کے عمل کو اپنائے رکھا ہے یہی وجہ ہے فنون لطیفہ کے حوالے سے اس کا کردار بھی منفرد ثابت ہوا ہے۔

"موسیقی" اور انسان کا تعلق بہت پرانا ہے۔موسیقی کے ساتھ انسان کی جذباتی ہم آہنگی ہمیشہ سے رہی ہے۔ادبیات نے انسان اور اس کا موسیقی سے جمالیاتی و جذباتی تعلق کو صحیح طور پر سمجھا ہے۔موسیقی کی تاریخ، فن موسیقی اور برصغیر کی کلچرائی و مقامی موسیقی کو سامنے لاتے ہوئے آئندہ کے لیے لائحہ عمل جامع

مضامین کی شکل میں پیش کیا ہے۔موسیقاروں کا کردار اس ضمن میں بہت اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے ایک اچھا موسیقار سماج اور فرد کے مطابق جمالیاتی ذوق کا نہ صرف محافظ ہوتا ہے بلکہ اس کی ترقی کا بھی خواہاں ہوتا ہے۔"ادبیات سہ ماہی " کے مختلف شماروں میں جن اہم موسیقاروں کا ذکر ملتا ہے ان میں عابدہ پروین، ریشماں، نثار بزمی، خورشید انور، اس کے علاوہ کلاسیکی موسیقاروں میں شفقت امانت علی، حامد علی، وغیرہ شامل ہیں۔ادبیات نے " خطاطی" کے جمالیاتی تناظرات کو بھی سامنے لایا ہے۔اس ضمن میں جو مضامین " ادبیات سہ ماہی " نے "خطاطی "اور فن خطاطی کے حوالے سے پیش کیے ہیں ان کی اہمیت وافادیت فنون لطیفہ کے حوالے سے اہم سمجھی جاتی ہے۔خطاطی کی تاریخ مسلم سلاطین کے ادوار سے ملتی ہے ۔ مسلم فن خطاطی کی تاریخ ،اس کے جمالیاتی تناظرات ،مصورانہ خطاطی، اس کے مختلف اندازِ تحریر اور موجودہ دور میں اس کی اہمیت وا فادیت کے حوالے سے مختلف مصنفین کے مضامین کو پیش کیا ہے۔پاکستان کے نامور خطاط کو ادبیات کے بہت سے مضامین میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔طاہر بن قلندر، آفتاب ظفر، صادقین جیسے خطاط اس حوالے سے اہم ہیں۔

"سنگ تراشی" کے فن نے انسانی جمالیاتی اقدار کو فروغ دینے میں صدیوں سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انسان نے بدھ مت اور ہندوازم کے ابتدائی ادوار سے ہی جو "سنگ تراشی" کا فن سیکھا تھا اسے آگے بڑھایا مختلف ادوار میں ہر زمانے کے نئے جمالیاتی پہلوؤں کے مطابق اس فن کا تحفظ کیا جاتا رہا۔" سہ ماہی ادبیات نے سنگ تراشی کی تاریخ، مسلم کے ہاں سنگ تراشی کے حلال اور حرام ہونے کے تصورات ،بتوں کے علاوہ دیگر ڈیکوریشن اور مختلف خوبصورت ظروف کو مٹی ، چینی اور پتھروں کی شکلوں میں پیش کرنا، جیسے موضوعات پر "سہ ماہی ادبیات "نے مضامین کی ذیل میں مثبت معلوماتی کردار ادا کیا ہے۔ادبیات سہ ماہی نے دیگر فنون لطیفہ کی بہ نسبت سنگ تراشی میں کام قدرے کم ہی سامنے لایا ہے۔عباس شاہ کا مضمون اس حوالے سے اہم ہے۔ مسعود کوہاری جو کہ ایک معروف سنگ تراش تھے ان کے فن، شخصیت اور جمالیاتی نکتہ نظر کو پیش کیا ہے اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس فن میں سمٹ کر آنے والی جدت کو بھی پیش کیا ہے۔

ب۔ تحقیقی نتائج:

۱۔ فنونِ لطیفہ اور ادب میں جمالیاتی اقدار کی اہمیت مسلّم ہے۔ ہر تہذیب کی جمالیات نے ہمیشہ فنونِ لطیفہ اور ادب کی صورت میں انسانی جذبات واحساسات کی عکاسی کی ہے۔ جمالیاتی نظریے کے اطلاق کے بغیر کوئی بھی فن پارہ کامل نہیں ہے. فنونِ لطیفہ اور ادب نے ہمیشہ انسانی شعور اور آگاہی کے سفر کو آگے بڑھایا ہے۔ ہر تہذیب کا فنونِ لطیفہ اپنے ادب کی جمالیاتی اقدار کا ضامن ہوتا ہے۔

۲۔ سیپ اور ادبیات نے فنونِ لطیفہ کے فروغ میں منفرد ادبی کردار ادا کیا ہے۔ اردو مضمون نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا، ادبی دھڑے بندی سے مبرا ہو کر ہر اچھی تخلیقی فن پارے کو سراہا، نیز فرد، زندگی اور ادب کی تکون کو یقینی بنایا ہے۔ معاصر ادبی صورتِ حال میں ادبیات نے سیپ کی نسبت فنونِ لطیفہ کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ادبیات نے فنونِ لطیفہ کے ضمن میں مقامی، تہذیبی، جمالیاتی اقدار کو فروغ دیا ہے۔ سیپ نے مقامی کے ساتھ باقاعدہ طور پر عالمی سطح کی جمالیاتی اقدار کو بھی فنون میں شامل کیا ہے۔

۳۔ درج بالا تحقیق نے منتخب فنکاروں کے جمالیاتی ذوق سے آگاہی میں اہم کردار ادا کیا ہے یوں قاری میں نہ صرف جمالیاتی ذوق پیدا ہوتا ہے بلکہ اسے مقامی اور عالمی تہذیبی جمالیاتی اقدار کو سیکھنے کا بھی موقع ملتا ہے۔ ادبی فن پارے میں الفاظ کا انتخاب، الفاظ کے استعمال کا انداز، لفظ و معنی کا باہمی انسلاک، جملہ بندی کا انداز اور جملے میں الفاظ و تراکیب کے ربط سے تحریر میں حُسن پیدا ہوتا ہے۔ منتخب جرائد کے چُنیدہ مضامین میں زاہد ہمایوں کے پیش کردہ جمالیاتی تحریک کے تینوں پہلو مترشح ہوتے ہیں۔ اول پہلو یہ کہ ناظر یا سامع براہ راست کسی شے کو دیکھ یا سُن کر حواس کے توسط سے اس شے سے حظ اٹھائے؛ دوم پہلو یہ کہ سامع یا ناظر کو کسی شے کے براہ راست سننے یا دیکھنے کے بعد مذکورہ شے سے وجدانی معانی حاصل ہوں، یعنی الفاظ و معانی کے تعلق کی تفہیم سے روحِ تخلیق تک رسائی حاصل ہو؛ سوم پہلو یہ کہ حواس اور وجدان کے ملاپ سے متشکل ہوتی تحریک سے ایک نیا سلسلہِ ادراک قائم ہو جائے، جس سے نئے معانی و مفاہیم کا سلسلہ آغاز ہو۔

ج۔ سفارشات:

تحقیقی اور مجموعی جائزے کے بعد درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں۔

۱. ادبیات کے ضمن میں اسی (۸۰) اور نوے (۹۰) کی دہائی میں فنونِ لطیفہ کا تحقیقی جائزہ تشنہ طلب ہے۔

۲. موسیقی، مصوری، سنگ تراشی اور خطاطی کے علاوہ ادبی رسائل کے ضمن میں دیگر فنونِ لطیفہ فنِ تعمیر، رقص، فلم سازی وغیرہ پر تحقیقی کام ادب کے لیے گراں قدر ثابت ہو سکتا ہے۔

۳. فنونِ لطیفہ کی پیشکش میں اردو ادبی رسائل پر تحقیقی کام تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو ان منتخب رسائل سیپ، ادبیات کے علاوہ دیگر ادبی رسالوں، جریدوں اور دیگر مجلوں پر ہونا چاہیے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

محمد عاصم بٹ،(مدیر) ادبیات، سہ ماہی کتابی سلسلہ، اکادمی ادبیات، اسلام آباد

نسیم درانی (مدیر)، سیپ، سہ ماہی کتابی سلسلہ، سیپ پبلی کیشنز، کراچی

ثانوی ماخذ:

آل احمد سرور، پروفیسر: مجموعہ تنقیدات، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵

ابوسلیمان شاجہانپوری، ڈاکٹر، عطش درانی، پاکستان کے اردو اخبار و رسائل، مقتدرہ قومی زبان اردو، اسلام آباد، ۲۰۱۳

احسان شوق، دنیا کے عظیم مصور، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۱۴

ارشاد علی خان، پروفیسر، جدید اصولِ تنقید، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰

ارنسٹ کوہسل، مترجم، غلام طیب، مولانا، اسلام آرٹ اور فنِ تعمیر، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۸

اسلم کمال، اسلامی خطاطی ایک تعارف، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۵

انجم شیرازی، مبادیات موسیقی، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۵

انور سدید، ڈاکٹر، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اکادمی ادبیات، پاکستان، ۱۹۹۲

انور سدید، ڈاکٹر، ادبی جرائد مشمولہ پاکستان میں، مقتدرہ قومی زبان اردو، اسلام آباد، ۲۰۰۴

بشیر الدین، حکایاتِ لطیفہ، مطبوعہ دلی پرینٹنگ ورکس، دہلی، ۱۹۱۴

بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، گنج شکر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۰

ثریا حسین، ڈاکٹر، جمالیات اور ادب، لیتھو کلر پرنٹرز، علی گڑھ، ۱۹۷۹

جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،، ۱۹۹۱

جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تحریر، یونیورسل بکس لاہور، ۱۹۶۷

حامد اللہ افسر، تنقیدی اصول و نظریے، ، پنجاب پریس، لاہور، ۱۹۵۴

حسن اختر، ملک، تنقید اور تنقیدی جائزے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳

خدا بخش، فنونِ لطیفہ، اور نٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ، بھارت، ۱۹۸۲

خورشید عالم گوہر، مخزنِ خطاطی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵

راشد انور راشد، فنونِ لطیفہ (چند مضامین)، علی پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۰۰

رضا بیدار، ڈاکٹر، اردو کے اہم ادبی رسالے، انسٹیوٹ آف اور نٹیل، لاہور، ۱۹۶۹

رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصنافِ ادب، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۸

سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور کلچر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲

سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۷

سلیم اختر، ڈاکٹر، تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱

شارب ردولوی، ڈاکٹر، جدید اردو تنقید اصول و نظریات، اردو اکادمی، لکھنو، ۱۹۸۷

شیما مجید، فنِ مصوری (منتخب مضامین) پاکستان رائیٹرز کو آپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۰۵

صاحبزادہ حمید اللہ، فن اور تکنیک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰

ظہور چوہدری، ڈاکٹر، جہانِ فن، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۵

ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر، ادب میں جمالیاتی اقدار ایک مطالعہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۱

عابد علی عابد، سید، انتقاد ادبیات مجلس، ترقی ادب روڈ، لاہور، ۱۹۶۶

عابد علی عابد، سید، اسلوب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱

عابد حسین عابد، پاکستان میں مصوری، پاکستان رائیٹرز کو آپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۰۸

عبد اللہ، سید، ڈاکٹر، اشاراتِ تنقید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰

عبد اللہ، سید، ڈاکٹر، اشاراتِ تنقید، کتب خیابان، ادب، لاہور، مئی ۱۹۶۶

عقیلہ شاہین، ڈاکٹر، یاز فتح پوری، فن اور شخصیت،، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۵

عنایت الہی، ملک، برصغیر کی موسیقی، ناظم مجلس، ترقی اردو، لاہور، ۲۰۰۹

فاخر حسین، مضامین جمالیات، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۸

فرحان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو نثر کا فنی ارتقاء، گنج شکر پریس، لاہور، ۲۰۱۵

گیان چند، ڈاکٹر، تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان اردو، پاکستان، ۱۹۹۴

مبارک علی، ڈاکٹر، قدیم ہندوستان، ایکشن اینڈ انٹرنیشنل پاکستان، لاہور، ۲۰۰۷

مجنوں گھورکھپوری، ادب اور زندگی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۷

محمد اکرام، پاکستان کا ثقافتی ورثہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۱

محمد مظفر حسین، فنونِ لطیفہ اور جمالیات، ضیاء پبلیشنگ ہاؤس، مقبرہ جنابھالیہ گورگنج، لکھنو

محمود الحسن، پاکستان کے اردو خبارات ورسائل، (جلد اول) مقتدرہ قومی زبان اردو، اسلام آباد، ۱۹۸۵

مرزا سلطان احمد، فنونِ لطیفہ، مکتبہ جمال، لاہور، ۲۰۰۹

مشتاق صدف، اردو صحافت (زبان، تکنیک، تناظر)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱

معین الدین عقیل، ڈاکٹر، رسمیات مقالہ نگاری، پاکستان اسٹڈی منسٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۰۹

میاں آصف رشید، مجسموں کی دنیا، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۰

نجات اللہ صدیقی، پروفیسر، اسلام اور فنونِ لطیفہ، المطوا پریس، دہلی، ۲۰۱۲

نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر: تاریخ جمالیات (جلد اول)، فیروز سنز لمیٹڈ،، لاہور ۱۹۹۰

نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر: تاریخ جمالیات (جلد دوم)، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۰

نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر: اقبال اور جمالیات، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۱

نعیم نقوی، پروفیسر: تنقید و تناظر، غضنفر اکیڈمی پاکستان، کراچی، ۱۹۸۶

نعیم نقوی، پروفیسر: تنقید و آگاہی، غضنفر اکیڈمی پاکستان، کراچی، ۱۹۸۸

نوشابہ سردار، ڈاکٹر: بیسویں صدی میں اردو تنقید کا ارتقاء (جلد اول) ایم زیڈ پبلی کیشنز، آلہ آباد، ۲۰۰۰

نیاز فتح پوری، انتقادیات، (اول، دوم) حلقہ نیاز و نگار، کراچی، ۱۹۹۱

وزیر آغا، ڈاکٹر، تخلیقی عمل، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۰

وزیر آغا، ڈاکٹر: تنقید اور جدید اردو تنقید، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۹

یوسف حسین خان، ڈاکٹر: غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات، اردو آرٹ پریس، لاہو، ۱۹۸۶

مقالہ جات

۱. آصف جہانگیر، سیپ کے تخلیقی اور فکری کردار کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۲، (غیر مطبوعہ)

۲. تیمور اختر، ادبیات کے شخصیات نمبرز کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے ایم فل اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون سائنس و ٹیکنالوجی، اسلام آباد، ۲۰۱۷، (غیر مطبوعہ)

۳. خان سعادت، ماہنامہ سیارہ کی علمی و ادبی خدمات، مقالہ ایم فل اردو، اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، (غیر مطبوعہ)

۴. سعدیہ افتخار، اکادمی ادبیات پاکستان کی خدمات، تحقیق و تنقیدی جائزہ (اردو زبان کے حوالے سے)، مقالہ برائے ایم فل اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد، ۲۰۱۵ (غیر مطبوعہ)

۵. سید فاضل حسین، معاصر اردو افسانے کے فکری رجحانات کا تجزیاتی مطالعہ (سہ ماہی ادبیات ۲۰۰۱ تا حال میں شائع شدہ افسانوں کے حوالے سے)، مقالہ برائے ایم فل اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد، ۲۰۱۹ (غیر مطبوعہ)

۶. فاخرہ اکبر: پاکستانی اردو غزل میں جمالیاتی عناصر، مقالہ ایم فل اردو، اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۹۸

لغات

۱: فرہنگ عامرہ، محمد عبداللہ خان، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۹

۲: فیروز اللغات، اردو، نیا ایڈیشن، لاہور، ۲۰۱۳

۳:	نور الحسن، نیر، مولوی، نور اللغات، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۹

۴:	وارث سرہندی، علمی اردو لغت، جامع علمی کتب خانہ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۲

ویب سائٹس:

۱. www.urdupoint.com

۲. www.rekhta.org

۳. www.urdumaza.com

۴. www.sangemeel.com

۵ www.awazsayeed.com/ebook.html

۶. www.kitaabghar.com

۷. www.urdurasala.com

۸. www.urdustudies.com